ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

آدان پردان

بنگرواڈی

وینکٹیش ماڈگولکر

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

بنگرواڑی

ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

بنگرواڈی

مصنف

وینکٹیش ماڈگولکر

مترجم

عرش ملسیانی

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
نئی دہلی

جولائی ۱۹۷۲ (اساڑھ ۱۸۹۴)

ORIGINAL TITLE : BANGARAWADI (MARATHI)

URDU TRANSLATION : BANGARAWADI

قیمت:- ۵/۲۵

تقسیم کار
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی ۲۵ ، دہلی ٦ ، بمبئی ۳ ، علی گڑھ ۲

ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا 5/۸ گرین پارک نئی دہلی ۱٦ نے لبرٹی آرٹ پریس
(پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج دہلی میں چھپوا کر شایع کیا

پیش لفظ

ہندوستان ایک وسیع مُلک ہے جو اگرچہ تہذیبی حیثیت سے متّحد ہے مگر پھر بھی اُن رشتوں کو مضبوط تر بنانے کی ضرورت ہے جن سے وہ ایک واحد، طاقتور اور ترقّی پسند قوم بن سکے۔

ہمارے مُلک میں متعدّد زبانیں ہیں جو تعداد میں دُنیا کے کسی بھی مُلک میں رائج زبانوں سے زیادہ ہیں مگر بد قسمتی سے ہمیں اپنی پڑوسی زبان یا زبانوں سے نہ دل چسپی ہے نہ اُن کی معلومات، بلکہ اپنی زبانوں سے زیادہ ہمیں مغرب کی زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جرمنی وغیرہ کے سماجی و ادبی پس منظر سے واقفیت ہے۔

مُلک کے جذباتی و تہذیبی اتحاد و یک جہتی کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ ہمارے شہری ایک دوسرے کی زبانوں کی بہترین تصنیفات سے آشنا ہوں، اور اس طرح ایک دوسرے کے طرزِ زندگی اور ادبی حصول کو قریب سے جانیں اور سمجھیں۔

مغرب میں بھی بہت سی قومیں ہیں، ہر ایک کی اپنی الگ زبان ہے مگر وہ لوگ ایک دوسرے کے فکر و ادب کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمارے مُلک میں حالات اِس کے مُتضاد ہیں ــــ کسی مغربی زبان میں کوئی اچھی کتاب شایع ہوتی ہے تو وہ فوراً دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو جاتی ہے، لیکن ہندوستان میں ہم، ایک قوم ہوتے ہوئے، یہ تک نہیں جانتے کہ پڑوس کی زبان میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ ویسے حالات بدل تو رہے ہیں مگر اس تبدیلی کی رفتار نہایت سُست ہے۔

اِس صورتِ حال کے مدِّنظر، حکومت نے ایک اسکیم بنائی ہے کہ ہر زبان سے موجودہ یا تقریباً موجودہ زمانے کی چُنندہ کتابیں دوسری زبانوں میں ترجمہ کی جائیں، یہ کتابیں عام دل چسپی کی ہوں گی۔ مثلاً مختصر افسانے، ناول، دل چسپ سفرنامے یا سوانح حیات وغیرہ ــــ ایسی مقبول تصنیفات کو ترجمہ کیا جائے گا جو کسی بھی لسانی علاقے کی طرزِ زندگی، سماجی و تہذیبی سرگرمیوں، جذباتی کیفیتوں اور ارمانوں کی نقاب کشائی کر سکے۔

اُمید کی جاتی ہے کہ یہ پروجیکٹ، ہمارے مُلک کے، مختلف الزبان سماج میں، علاقائی مفاہمت اور جذباتی یک جہتی کا کام کرے گا اور اِس مقصد میں کافی مدد دے گا۔

مختلف ہندوستانی زبانوں سے نُمایاں و مفید و دِل چسپ کتابوں کا انتخاب اور پھر ترجمہ آسان کام نہیں ہے ــــ ہم اپنی اُن کمیٹیوں، اپنے صلاح کاروں و ترجمانوں کے مشکور ہیں جن کی رہنمائی اور تعاون کے بغیر اِس قسم کا کوئی پلان عملی طور پر بار آور نہیں ہو سکتا تھا۔

بالکرشن کیسکر

دیباچہ

"بنگرواڈی" سب سے پہلے ۱۹۵۴ء میں ایک مراٹھی ہفتہ وار اخبار کے دیوالی نمبر میں اور اگلے سال ہی کتابی شکل میں شایع ہوئی۔ جلد ہی یہ تخلیق مراٹھی پڑھنے والوں میں مقبول ہوگئی اور سبھی نقادوں نے اس کی تعریف کی۔ یہاں تک کہ جدید تر اور تند مزاج نسل نے بھی لڑائی کے وقت کی صحیح اور حق پسندانہ تصویر کشی کے لیے اس تخلیق کی تعریف کی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ "دی ویلج ہیڈ نو والز" کے نام سے قومی اور بین الاقوامی قارئین تک پہنچا۔ انگریزی ترجمے کا دوسرا ایڈیشن اب ختم ہو رہا ہے۔ اس کا ترجمہ ڈینش زبان میں بھی ہو چکا ہے اور اس کے کچھ حصے امریکہ کے ادبی مجموعوں خاص کر "اے ٹریزری آف ایشین شارٹ سٹوریز"، "ٹونٹیتھ سینچری ایشیا" وغیرہ میں شامل کیے گئے ہیں۔ امن پسندوں، سوشلسٹوں اور دوسرے لوگوں میں جو ایک خاص حوصلہ مندی سے ہندوستان کی دیہاتی زندگی سے متعارف ہونے کی خواہش لے کر ہندوستان میں آتے ہیں، یہ ناول خاص طور پر مقبول ہے۔

بنگرواڈی کے زندہ رہنے کی بڑی وجہ اس کا آسان لہجہ اور طرزِ نگارش ہے۔ دیہاتیوں کا رومانی رجحان اور دیہاتی زندگی کی مبالغہ آمیزی اس میں نہیں ہے۔ کہانی کا ہیرو برہمن خاندان کا ایک نوجوان ہے جو اپنی روزی کمانے کے لیے پہلی بار اسکول ماسٹر ہو کر گڈریوں کے گاؤں بنگرواڈی میں تھوڑی مدت کے لیے آتا ہے۔ اسکول کیا تھا اپنے آپ میں ایک کثیر المقاصد جگہ تھی جو دھول اور پرندوں کی بیٹ سے گندی رہتی تھی۔ کمزور مالی حالت والی حکومت کے محکمۂ تعلیم نے ان گڈریوں کے لیے ضروری فرنیچر اور تعلیمی سامان بھی مہیا نہیں کیا تھا۔ گڈریے بھی اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کے بجائے بھیڑوں کے ساتھ جنگل بھیج دیتے تھے۔ اس اسکول کے ماسٹر کا پہلا کام تو یہ تھا کہ دیہاتیوں کو تعلیم کی ترغیب دے۔ اسکول آنے کے قابل عمر کے کچھ بچوں کو اکٹھا کرے اور پڑھائی کا سلسلہ شروع کرے۔ گاؤں کا بااثر مکھیا اس کا دوست بن جاتا ہے اور اسے اس کے کام میں ہر طرح کی مدد دیتا ہے۔

اسکول ماسٹر اس دیہاتی سماج کا ایک ضروری جزو بن کر اس کے دُکھ سُکھ کا حصّہ دار ہو جاتا ہے۔ باہمی تعاون، امداد اور اس کی ذاتی کوششوں سے گاؤں میں ایک اکھاڑہ (جمنیزیم) بنایا جاتا ہے جس کا افتتاح سرکار کے تہذیبی مکھیا کرتے ہیں۔ اس سے دیہاتیوں میں مسرت کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ کہانی کا ہیرو اسکول ماسٹر گاؤں کے معاملات بھیڑوں کو پالنے، کھیتی باڑی کے کام، موسم کے بتدریج تبدیل ہونے، پیدائش اور موت، جھگڑے فساد، آپس کی دشمنی اور آخر کار طویل مدت کے قحط سے نازل شدہ تباہی کا سچا ناظر ہے۔ وہ طالب علموں کے دماغوں کی رفتار اور باہر کی شخصیتوں کی اس طاقت کو جو دیہاتی زندگی کو ہمدردی مگر سختی سے سمجھتی ہے تیز روی دیتا ہے۔ ٹیری وینکٹیش ماڈگولکر نے اپنی روح کو دیہاتی زندگی کی عکاسی میں خوب گھلا ملا دیا ہے اور یہی بنگر واڈی کی کامیابی کا راز ہے۔

اصل میں یہ ناول ایسا ہے جیسے خاکوں کا ایک مجموعہ جس کی اپنی نجی حیثیت تو ہوتی ہے لیکن جو طرح طرح کے رنگوں والی ایک بڑی کینوس کا ایک جزو بھی ہے۔ یہاں کوئی روایتی ہیرو نہیں ہے۔ ہیرو تو ایک طرف کوئی بدمعاش بھی نہیں ہے اور ایک ہے بھی تو اس کی بدمعاشی بھی یقینی طور پر قدرتی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے بھی انسانیت اور نیکی چھپی ہوئی ہے۔ وہ بنیادی طور پر جُرم کا جذبہ لیے ہوئے نہیں ہوتا۔ چور کھانے کی چیز چُرا لیتا ہے لیکن پکڑے جانے پر اقرارِ جُرم کر لیتا ہے۔ اس کتاب میں شرارت اور شہوانی جذبہ نہیں ہے بجز اس مقام کے جب کہ انجوشیکو سے کچھ روٹھ کر کسی اور گڈریے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے یا قریب کے ایک گاؤں کی خوب صورت بیوہ کے ساتھ رومیشی کے بھاگنے کی کوشش جس میں وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ بنگر واڈی کی تصویر کو کسی بھی فریم میں فٹ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے کردار ایسے نہیں جو شہری زندگی سے تبدیل کیے گئے ہوں۔ ان کے مکالمے، انداز اور ان کی مکمل شخصیت یقینی طور پر دیہاتی زندگی کا یقینی جزو ہیں۔ ان میں ایسا کچھ نہیں جو ان کا اپنا نہ ہو، اسی لیے عورت یا مرد، بھلا ہو یا بُرا سبھی مکمل طور پر جیتے جاگتے انسان ہیں۔ وہ بے شمار مصیبتوں کو جھیلتے ہوئے بھی اپنی زندگی کی آمد و شد میں بے فکری سے مگن ہیں۔ ان کی زندگی کسی علت و معلول کا نتیجہ ہوئے بغیر دائمی ہے۔

دیہاتی زبان میں بات چیت جنم ہی سے اُن کی گھٹی میں ہے۔ 'بنگر واڈی' میں دیہاتی زبان کا استعمال مصنف نے کسی طرح کا اثر ڈالنے کے لیے نہیں کیا ہے۔ دیہاتی مکالمہ وہیں ہے جہاں موزوں ہے یا جہاں کرداروں کی اصل حیثیت کے لیے ضروری ہے۔ ایسے مکالموں کے استعمال میں مصنف

نے اتنا ڈلاپن نہیں دکھایا۔ اس نے دیہاتی محاوروں کو بنا سنوار کر اور کہیں کہیں تو گمبھیر معنی والے سنسکرت الفاظ اور فقروں کے ٹکڑوں تک استعمال کرنے میں جھجک نہیں دکھائی۔ عوام کے غیر تحریر شدہ قانون جو قدرت کی تبدیل شدہ صورت سے مکمل طور پر وابستہ رہتے ہیں انسانی زندگی کے تمام نیک وبد کے ساتھ، دیہاتی زندگی کی شرافت، حسد اور رحم کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ بنگر واڈی کے ایسے کئی ڈرامائی موڑ ہیں جو قدرت کے مستور لیکن سخت قوانین اور ان سے وابستہ انسانی تقدیر کے دینے والے ہیں۔

مراٹھی پڑھنے والوں نے بنگرواڈی کا اس لیے بھی استقبال کیا کہ وہ ۱۹۳۵ء سے چلی آرہی مراٹھی ناول کی مقررہ روایت سے مختلف تھی۔ صرف چند تخلیقات کو چھوڑ کر جن میں وُدے دیکر کی رنن گن، بھی ہے، زیادہ تر ناول ایک ہی لکیر کے فقیر تھے جن کا اہم موضوع متوسط اور اونچے درجے کے شہری لوگوں کی اپنی خوابوں کی دنیا کی تکمیل ہوتا تھا۔ ایسے ناولوں کا پہلے تو خوب استقبال ہوا لیکن بعد میں قارئین کو ان سے کوئی خاص دل چسپی نہیں رہی۔ کردار اور ہیرو لکھنے والے کی کٹھ پتلی بن کر رہ جاتے تھے۔ اس طرح مراٹھی ناول کا بہاؤ کچھ رُک سا گیا اور ایک محدود دائرے میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ نئی نسل کے لکھنے والے نئی راہ کی کھوج میں تھے اور نئے پن کی خواہش لیے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال کا ان پر بڑا تیز ردّ عمل ہوا۔ انھوں نے زندگی سے متعلق اچھوتے اور زندہ موضوعات کا انتخاب کیا۔ اس خیال سے ہی انھوں نے مختلف علاقوں کے پس ماندہ طبقے کی تصویر کشی کی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب علاقائی تصویر کشی ایک فیشن بن گئی۔

اس زمانے کے مراٹھی ناولوں میں شہری زندگی کے پس ماندہ طبقے، مختلف دیہاتی اونچی نیچی ذاتوں اور غیر ترقی یافتہ گروہوں کا بیان ہے۔ شہر کا مصنف سماج کے ان طبقوں کی تصویر کشی بے پناہ ہمدردی کے جذبے میں بہ کر کر سکتا ہے لیکن صرف ہمدردی سے اعلیٰ درجے کی تخلیق وجود میں نہیں آسکتی۔ وِبھاوری، سروکر، تھوکل، دِگھے اور دوسرے مصنفوں نے اسی دیہاتی زندگی کی رومانی تصویر پیش کی ہے جو غیر قدرتی بھی ہے اور مریادا کے خلاف بھی لیکن ناولوں میں بیان کی گئی زندگی کو جیتے جاگتے انسانوں کی زندگی ہونا چاہیے تاکہ ناول نگار خاص قسم کی ضد کو چھوڑ کر قدرتی اور آسان نظر آنے والی تخلیقات پیش کرے تاکہ قارئین ان دیہاتی گروہوں کو اپنا سکیں۔

بنگرواڈی میں گڈریوں کی زندگی، مصیبت، دکھ اور خوف وہراس کی زندگی ہے۔ وہ شہری تمدّن

اور تہذیب سے الگ زندگی ہے۔ گڈریوں کے دُکھ، بے خوفی، افلاس، جہالت، علم سے نفرت، قدرت کا غضب، بدنصیبی، انسانیت اور گھاس پھوس کی جھونپڑیوں کا نام بنگرواڑی ہے۔ اس ناول میں ان سب کی مفصل اور دل کش تصویر ہے۔

وینکٹیش ماڈگولکر نے اگرچہ سب سے پہلے یہی ناول لکھا تھا اور جب سے ہی وہ دیہاتی زندگی سے معمور اور زندہ خاکوں کے اونچے درجے کے مصنف کی حیثیت سے مانے جاتے رہے ہیں۔ ان کا دوسرا ناول 'بنتال'، جو گاندھی جی کی موت کے بعد کے مسائل سے متعلق ہے اتنا کامیاب نہیں رہا۔ وہ لگاتار مضامین اور افسانے لکھنے میں لگے رہے۔ بنگرواڑی کی عظمت کی وجہ ان کی افسانہ گوئی کی مہارت ہے جو ان کا حق ہے۔ ماڈگولکر ہی صرف ایسے مصنف نہیں تھے۔ ان کے ہم عصر شری ایس۔ این۔ پنڈسے، ہرنئے، مرڈ اور دیولی وغیرہ مغربی زندگی کے طور طریقوں کو اپنے ناولوں سے ظاہر کر رہے تھے۔ پینڈسے کے کردار صرف گاؤں کے نیچے درجے کے نہیں ہیں۔ وہ زیادہ تر اونچے درجے کے خاندان ہیں۔ ان کا ناول 'حد پار' بنگرواڑی کی طرح ایک اسکول ماسٹر کا کردار پیش کرتا ہے لیکن وہ ناول کا اصل ہیرو ہے صرف کہانی کا جزوی کردار نہیں۔ اس کے دوسرے مرد عورت کردار سماجی ترقی کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ وہ گاؤں سے قصبے میں اور قصبے سے شہر کو جاتے ہیں۔

پچھلے پندرہ سال میں دیہاتی سین سے ہٹ کر پھر تیزی سے بڑھتی ہوئی شہری زندگی کی طرف جھکاؤ ہوا ہے۔ بہت سے نوجوان ناول نگاروں نے شہروں کے جھونپڑوں میں رہنے والے طبقے کی تصویر کشی کی ہے جن میں جے ونت دلوی کا 'چکر'، ایم۔ ایم۔ کارنک کا 'ہچی کھادی'، بھاؤ پادھے کا 'وسونک'، بہترین ہیں۔ ناول لکھنے والوں نے شہر کی پھیکی، بے مروت زندگی، اس کی مردہ بنیادوں اور آلودہ سیاست کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ ناول دوسرے ملکوں کے آدرشوں کے باب میں ناامیدی اور یاسیت کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان مصنفوں نے ہندوستانی شہری زندگی اور اس کے مسائل کو اس کے اندر ہی سے پکڑا ہے۔ اس گروہ کے نمائندہ ناول ہیں؛ بال چندر نیم دے کا 'کوسل'، اور بھاؤ پائے کا 'بیرسٹر انی رُدھ دھو پیشور کر'۔ یہ مراٹھی ناولوں کی کئی مختلف قسمیں بھی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد شاعری اور کہانی کی طرح مراٹھی ناول بھی روایت سے ہٹ کر چلا ہے۔ اس میں بے فائدہ رومانی ہیجان ختم ہو گیا اور اس کا جھکاؤ نئی سمتوں کی طرف ہوا ہے۔ اگرچہ سب کو ادبی تخلیقات

کی شکل میں قبول کرنا مشکل ہے کیوں کہ ان میں تجربے اور گہرائی کی کمی ہے۔ اس پر بھی مراٹھی ادیب بہت بیدار ہے۔ بحیثیت مجموعی ناول کی تنقید کے ساتھ ساتھ مراٹھی ناول میں بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔ ایک سو پچیس سال کی مدت میں مراٹھی ناول ایک مکمل ترقی یافتہ اور تروتازہ ادبی صنف کی شکل میں زندہ ہے۔ ترقی کے اس دور میں بنگرواڈی دیہاتی زندگی کی تصویر کشی کرنے والے ناول کی حیثیت سے بے شک وشبہ ایک قابلِ فخر تخلیق ہے!

(۱)

روٹیوں کا جھولا بیٹھ پر لٹکائے میں بنگرواڈی جانے کے لیے نکل پڑا تھا۔

اب تک چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تارے چمک رہے تھے۔ سامنے بل کھاتی ہوئی گاڑی کی سڑک دھندلی سی نظر آرہی ہے؟ کتنی دیر بعد اجالا ہوگا؟ اس کا اندازہ یقینی طور پر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دل میں یہ شک بار بار اٹھ رہا تھا کہ میں کہیں بہت جلد تو نہیں نکل پڑا ہوں۔ میرے ہی پیروں کی آواز مجھے کافی پر شور لگ رہی تھی۔ جھینگر الگ اس خاموشی کے دشمن ہو رہے تھے۔ ٹھنڈی ہو کانوں میں گونج رہی تھی۔ بہت دیر تک چلتے رہنے کی وجہ سے جسم میں ایک لے سما گئی تھی۔

راستہ بھٹک جانے کا ڈر الگ تھا' کیوں کہ اس سے پہلے میں بنگرواڈی نہیں گیا تھا۔ یہ گاؤں کیسا ہوگا؟ اور وہاں کیا ہوگا؟ اس گاؤں کے لوگ مجھ سے کیسا برتاؤ کریں گے، وہاں جاکر کہاں رہوں گا؟ میں ایسے سوالات اپنے آپ ہی سے پوچھ رہا تھا۔ دو دن وہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر مجھے لوٹنا تھا۔ وہاں مستقل طور پر رہنا ہوتا تو کچھ سامان وغیرہ لے جانا ضروری تھا لیکن آج تو میں صرف دھوتی، چادر اور ایک دو کپڑے لے کر ہی جا رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی، تارے مدھم پڑ گئے لیکن ان میں نہ تو ابھی ڈھنگ کی روشنی تھی اور نہ ابھی ڈھنگ سے پو ہی پھٹی تھی۔ یہ کہیے کہ جُھٹ پٹے کا سا عالم تھا۔ پیڑ پودوں کی جانی پہچانی خوشبو کا احساس ہونے لگا، راستے کی دھول پیروں کو ٹھنڈی لگنے لگی۔

دیکھتے دیکھتے اندھیرا غایب ہوگیا اور ہر چیز نظر آنے لگی۔ پیڑ، پودے، پتھر سب کو شکل مل گئی۔ تارے اوجھل ہو گئے، جھینگروں کا گانا رُک گیا۔ نیند سے جاگے ہوئے کووں کی بھاری کائیں کائیں سنائی دی۔ لال پیلا سورج سطح مرتفع کی اوٹ سے باہر آیا۔ ہری سی روشنی پر پیلی چمک آگئی۔ بیر کی جھاڑیوں میں چڑیاں جاگ پڑیں اور دم نچا نچا کر شور کرنے لگیں۔ جھاڑیوں میں پر پھیلا کر بیٹھے ہوئے 'ہولے' پروں پر کھڑے ہو کر آواز دینے لگے اور کوّے اڑان بھرنے لگے۔

سطح مرتفع کی سوکھی ہوئی گھاس سورج کی پہلی کرن سے گرما گئی۔ اس کے نیچے بسی ہوئی کیڑوں کی

دنیا جاگ اٹھی۔ چیونٹیاں چل پڑیں اور ٹڈیاں کودنے لگیں۔ گرگٹ سرسرانے لگے۔ زمین میں سوراخ کر کے رہنے والے اوپر سے گرنے والے کیڑوں کو کھا جانے کے لیے بدن پر مٹی لگا کر تیار ہو گئے۔ جھرمٹ کے تنے پر بیٹھے ہوئے ہرے رنگ کے چمکیلے بھونرے جھرمٹ کی کسیلی پتیاں کھانے لگے۔ اسی اونچے میدان میں جو بل تھے ان میں سے گوہوں نے اپنے سر نکالے اور گلے کے نیچے کا حصّہ ہلاتے ہوئے زبان کی پہنچ میں آنے والے کیڑوں کی راہ دیکھنے لگیں۔

مور پیڑ کو چھوڑ کر راستے پر آ گئے اور خوب صورت گردنیں ہلاتے ہوئے دھول میں پڑے ہوئے گھاس کے بیجوں کو چگنے لگے۔ ساری گھاس پر ان کے پیروں کے نشان اس طرح ابھرنے لگے جیسے نقاشی کی گئی ہو۔

پیٹھ پر پڑے ہوئے جھولے کو ہاتھ میں لے کر میں جلدی جلدی چلنے اور ننگے پیروں سے دھول اڑانے لگا۔ پاجامے کی پھڑ پھڑ کی آواز سے راستے کے ڈھولے، خوف زدہ ہو کر اونچی اڑانیں بھرنے لگے۔ میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلتا گیا۔ اس طرح چلنے سے خالی پیٹ نیچے کو بیٹھنے لگا۔ تھیلی میں سے پراٹھوں، لہسن کی چٹنی اور کبڑے کی تلی ہوئی بڑیوں کی خوشبو بہت آنے لگی لیکن میں سختی سے قدم بڑھاتا ہی چلا گیا۔ انگلیوں کی دراڑوں کے نیچے سے دھول اوپر آ رہی تھی۔ اس کی تہیں پیروں پر جم رہی تھیں۔ پاجامہ میلا ہو رہا تھا اور راستہ زیادہ سے زیادہ لمبا ہوتا جا رہا تھا۔

آس پاس پیلے اور خاکی رنگوں کا بلند میدان (پٹھار) پھیلا ہوا تھا۔ جدھر دیکھو کھلا سطحی میدان تھا۔ پہلے ہی سے چلچلاتا ہوا یہ میدان دھوپ کی وجہ سے اور بھی زیادہ چلچلاتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ کہیں کہیں نچلے حصّوں میں پیڑوں کے جھنڈ ایسے لگتے تھے جیسے ہرے ہرے دھبّے ہوں جب کہ چاروں طرف پتھریلا سطحی میدان تھا۔ جھڑبیری، کیکر و ببول اور جھاڑیوں کے چھوٹے چھوٹے جُھنڈ تھے۔ ان جھاڑیوں کے نیچے سے گزرنے والی دھول سے بھری ہوئی اور پتھروں سے اٹی ہوئی، کہیں چوڑی کہیں تنگ، گاڑی کی کچی سڑک نظر آئی۔

دھیرے دھیرے سورج اونچا ہوا۔ علی الصبح جو میدان خوب صورت نظر آتا تھا، تمتمانے لگا۔ پرندوں کی صبح دم کی چہچہاہٹ ختم ہو گئی۔ کوئی ایک آدھ مٹیالے رنگ کی پہاڑی گوریا تیر کی طرح غوطہ لگاتی، اس کی مدھم سُر کی سیٹیوں میں مَیں خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ ایک باز تیزی سے زمین کی برابر اڑتا ہوا گیا اور چڑیوں نے چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا لیا۔

آس پاس کی زمین کے کچھ ٹکڑے کہیں لال اور کہیں کالے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے

ان میں ہل چل چکا ہو۔ بے جتی زمینیں دھوپ کی مار کی وجہ سے اُدھڑی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ پنڈلی تک پیر دھنس جاتا تھا۔ یہ سب دراڑوں کی وجہ سے تھا۔ جب یہ زمینیں آئیں تو میں سمجھا کہ بستی اب نزدیک آگئی ہے۔ یہ سمجھ کر میں بار بار افق کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن گھر نظر نہیں آ رہے تھے اور کوئی جھاڑی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

دھوپ بہت تیز ہو گئی۔ صبح کے وقت ٹھنڈے گارے کی طرح لگنے والی دھول گرم ہو گئی۔ میرے سر کے چاروں طرف مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔ سر سے ٹوپی اتار کر میں نے ان پیچھا کرنے والی مکھیوں کو بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ کہاں بھاگتی تھیں۔ سو دو سو مکھیاں میرے ساتھ ساتھ سر کے چاروں طرف بھنبھناتی ہوئی چلتی ہی رہیں۔ 'یہ آدمی ضرور ایسی جگہ جا رہا ہے جہاں دوسرے آدمی بھی رہتے ہیں۔ اسے ان کی سمت صحیح طور پر معلوم ہے۔ اس کے ساتھ جائیں تو یقیناً اس جگہ پہنچیں گی جہاں کیچڑ اور پرنالے کا پانی ہوگا۔' غالباً اس احساس کو لیے یہ مکھیاں میرے سر کے چاروں طرف بھنبھناتی ہوئی میرے ساتھ چلتی ہی رہیں۔

(۲)

چاروں طرف ایک ہی طرح کا کھلا ہوا میدان تھا۔ باجرے کے لال کھیتوں کے درمیان مشکل سے تیس پینتیس گھر ایک پلنڈے کی طرح تھے۔ یہ تھی بنگرواڑی۔ زیادہ تر گھروں کی دیواریں مٹی کی تھیں۔ چھپر گھاس پھوس کے تھے۔ مٹی سے پُتے ہوئے بھی تھوڑے بہت گھر تھے۔ ہر گھر کے سامنے چھوٹا سا آنگن تھا۔ پرنالے کے پانی سے سینچے ہوئے نیم وغیرہ کے پیڑ تھے۔ گھر کے پیچھے کی طرف بھیڑوں کو بند کرنے کے لیے ببول کی کانٹوں کی باڑ سے بنے ہوئے باڑے تھے۔ کہیں دیوار کے سہارے گاڑی کا ٹوٹا ہوا پہیہ پڑا تھا۔ یہ سب کچھ ہمیشہ کی طرح ہی تھا۔ واڑی میں سڑک جیسی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ گھر بنانے کے بعد بچی ہوئی جگہ آنے جانے کے لیے استعمال کی جا رہی تھی۔ کافی گھروں کے دروازوں پر تالے تھے۔ دو تین چھوٹے بچے ایک گھر کے سامنے کھیل رہے تھے۔ گھروں کی پرچھائیاں دھول سے بھری ہوئی راہ پر پڑ رہی تھیں۔ سائے میں کہیں کتّا اور کہیں سیاہ و سفید مرغیاں آنکھیں موند کر بیٹھی تھیں۔

دائیں بائیں طرف گھر تھے۔ ان میں سے عورتوں نے جھانک کر دیکھا۔ بچے اندر کی طرف بھاگے۔ تھوڑا سا آگے جانے پر چوگان ملا۔ نیم کا ایک بڑا پیڑ ملا۔ اس کے چاروں طرف ایک چبوترا

تھا۔ ٹھنڈی چھاؤں دیکھتے ہی گرم مُرغ کی طرح میں اس پر جا بیٹھا۔ ٹوپی اتاری، پسینہ پونچھا، پیر جھٹک کر دھول جھاڑی، اس ٹھنڈی چھاؤں سے پسینہ سوکھ گیا اور طبیعت کو آسودگی ملی۔

بھوک لگی ہوئی تھی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ پانی کہاں ہے۔ ایسا کوئی شخص آس پاس دکھائی نہیں دے رہا تھا جس سے پوچھوں کہ پانی کہاں ہے۔ دل میں یہ خیال اٹھا کہ ویسے ہی سوکھا لقمہ حلق سے اتارلوں لیکن جتنی بھوک لگی تھی اتنی ہی پیاس بھی تھی۔ منہ کا لعاب سوکھ گیا تھا اور ذائقہ نمکین ہوگیا تھا۔ اس ٹھنڈی چھاؤں کو چھوڑ کر اٹھنے کی بھی خواہش نہیں ہورہی تھی۔ میں یوں ہی اکڑوں بیٹھا رہا۔ آس پاس سے کسی قسم کی آواز نہیں آئی۔ میرے سر پر ایک ٹہنی تھی۔ اس پر کوّوں کا ایک جوڑا بیٹھا تھا مگر وہ بھی اس وقت خاموش تھا۔

تھوڑی دیر بعد جس راہ سے میں آیا تھا اسی راہ سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ جان میں جان آئی میرے دل میں خیال آرہا تھا کہ اس آدمی کو آتے ہی پکاروں اور یہ بتاؤں کہ میں کیوں آیا ہوں۔ یہ بھی پوچھ لوں کہ پانی کہاں ہے اور روٹی کھالوں۔ اتنے میں وہ جوان گاؤں میں گھسا اور آکر سامنے کھڑا ہی ہوگیا۔

اس کے سر پر لال رنگ کا صافہ تھا، بدن پر کرتا تھا، دھوتی کے ساتھ ایک لمبا بھالا اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ بڑا اور لمبوترا تھا۔ گال کی ہڈیاں نکل آئی تھیں، ناک سیدھی تھی۔ مونچھوں کے بال کھچڑی تھے اور دھوئیں کا بھی ان پر رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ذرا بھی جھجکے بغیر اس نے مجھے ایک ہی نظر میں پرکھ لیا اور مونچھوں پر انگلیاں دے کر پیک تھوک دی۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ پیک میرے منہ کی طرف آرہی ہے، کسمسا کر میں نے پیر نیچے لٹکا دیے اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس نے پھٹکارنے والی آواز بنا کر پوچھا

"کیوں رے، کیا تو انڈے والا ہے؟"

اس سوال سے میں چابک کھائے ہوئے آدمی کی طرح نیچے آگیا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے تو سوجھا ہی نہیں کہ کیا جواب دوں۔ میرے اس پاجامے نے تو مجھے یک لخت نیچے کھینچ لیا تھا۔ کھلے پیسوں کی تھیلیاں لے کر مجھے گاؤں دیہات سے انڈے خریدنے والا مسلمان بنا ڈالا۔ میں گڑبڑا گیا اور حیرت زدہ ہوگیا۔ چہرے پر ایک جھینپی سی مسکراہٹ آئی۔ لٹکائی ہوئی ٹانگوں کو اوپر کرکے میں نے ٹوپی ٹھیک کی اور کہا

"نہیں، میں ماسٹر ہوں۔"

یہ وضاحت سُن کر پوچھنے والے کو ایسا نہیں لگا کہ وہ کچھ غلط کہہ گیا ہے۔ بائیں پیر کا وزن دائیں پیر پر ڈال کر وہ بولا "ماسٹر!"۔

اس کو یقین ہی نہیں ہوا۔ گندا پاجامہ اور گھر پر دھوئی ہوئی دھاری دار قمیض پہنے ہوئے یہ ٹانگ برابر کا چھوکرا ماسٹر کیسے ہو سکتا ہے۔ جیسے خود لنگوٹی لگا کر اسکول جانا چاہیے اور تھوک سے سلیٹ صاف کرنی چاہیے ایسے چھوکرے کو ماسٹر کون کہے گا، اگر کہہ بھی دیا تو اسے ماسٹر بنائے گا کون؟

"ہشت، بے مطلب کی بکواس"

مجھے اپنی چھوٹی عمر اور دھوتی کوٹ نہ پہننے کے باب میں بُرا لگا۔ میں نے ذرا باوقار انداز میں کہا "ہاں میں نیا نیا ہی مقرر ہوا ہوں۔ آج سے میں یہاں ماسٹر بن کر آیا ہوں۔"

جو بھالا اس نے ہاتھ میں ترچھا پکڑا ہوا تھا اُسے جھنڈے کی طرح سامنے رکھ دیا اور توہین آمیز انداز میں کہا "واہ رے واہ یہاں ماسٹر نے کیا کرنا ہے۔ پاٹھ شالا کہاں چل رہی ہے واڑی میں بچے کہاں ہیں سرکار کو کیا معلوم نہیں؟ بالکل فضول اور واہیات بات ..."

اور صافے کو ٹھیک کرتا ہوا وہ چلتا بنا۔ جاتے جاتے ایک بار پھر دھول میں تھوکتا گیا۔ تنگ گلی سے جب تک وہ نکل نہیں گیا، مجھے اس سمت دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں بہت جھینپا۔ پھٹی ہوئی نیکر پہن کر پاٹھ شالا جاتے وقت جس طرح میری جان نکل جایا کرتی تھی ویسا ہی اس وقت میرا حال تھا۔ اس ایک ہی واقعے سے میرا حوصلہ ختم سا ہو گیا اور امید ٹوٹ سی گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس نوکری سے استعفیٰ دے دوں اور الٹے پاؤں لوٹ جاؤں کیوں کہ یہ کام تو اپنے سے ہوگا نہیں۔ یہاں پاٹھ شالا لگے گی نہیں، بچے آئیں گے نہیں، ماسٹر، پاٹھ شالا، شکشا اور تعلیم کا یہاں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اُداس چہرہ بنائے میں چبوترے پر بیٹھا رہا۔ اپنی تیز بھوک اور پیاس کو بھی کچھ دیر کے لیے بھول گیا۔ میں ایسے وقت میں اس تپتے ہوئے گاؤں میں آیا ہی کیوں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں بالکل تنہا ہوں۔

اور تب سفید مونچھوں والا ایک بوڑھا ہاتھ کی لکڑی ٹیکتے ہوئے کھیت کی طرف سے آیا۔ اس کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں۔ کاندھے پر ایک موٹا کمبل تھا جسے اس نے چاندی کے کڑے والے ہاتھوں میں بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ پاؤں میں جوتے تو تھے لیکن وہ خود کو گھسیٹتا اور کھینچتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ آکر میرے سامنے رکا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے مجھے غور سے دیکھا جیسے نشانیاں

پہچاننے کے لیے گم شدہ بھیڑ کو دیکھتے ہیں اور کہا

"ارے بچے، یہاں کیوں بیٹھا ہے؟"

میں نے کہا "میں ماسٹر ہوں، آج سے میرا تقرر یہاں ہوا ہے۔"

"ارے پھر ماسٹر ہو کر یہاں کیوں بیٹھا ہے، شالا میں بیٹھ۔"

بوڑھے کی اس بات سے میری ہمت بندھی۔ یہ آدمی بھالے والے پہلے آدمی کی طرح کا نہیں ہے۔

"پاٹھ شالا کی عمارت کہاں ہے مجھے تو یہ بھی اچھی طرح معلوم نہیں ہے۔" اس پر سامنے پھیلے ہوئے پڑاؤ کی طرف ہاتھ کی لکڑی اٹھا کر بوڑھا بولا "وہی تو ہے شالا۔ پڑاؤ ہی کے دو حصے شالا کے ہیں۔"

"وہ؟"

"ہاں، جا بیٹھ وہاں جا کر۔"

"اکیلا بیٹھ کر کیا کروں گا؛ بچے کہاں ہیں؟"

"بچے بکریاں چرانے گئے ہیں لیکن آئیں گے۔ جنگل ہی میں تو نہیں رہ جائیں گے۔"

"لیکن اتنے ہیں بھی کہ پاٹھ شالا لگے؟"

"ہیں! ڈھیروں ہیں اور بھی تو ہوں گے۔ ہر سال دس بیس بیاہ تو رچائے ہی جاتے ہیں۔ بچے ہوں گے۔ تم پڑھانے کا کام کرو، بس۔"

اس بات پر مجھے ہنسی آگئی۔ چبوترے سے نیچے کود کر میں نے جھولا اٹھایا اور کہا "مجھے بتائیے پانی کہاں ہے تا کہ میں کھانا کھالوں، پراٹھے لایا ہوں۔"

بوڑھا بولا "پانی کی کمی ہے واڑی میں۔ گرمی کے دنوں میں صاف ریگستان بن جاتا ہے۔ ایک دھار ہے۔ وہ! وہاں دیکھو!"

میں نے گلی کے عین سامنے کی طرف دیکھا۔ گاؤں کے باہر چونے پتھر کی منڈیر سے بنائی ہوئی دھار نظر آئی۔

"ہم گڈریوں کا پانی چلتا ہو تو منگائے دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "کیوں نہیں چلے گا۔ لوٹا مل جائے تو سوچتا ہوں میں خود ہی لے آؤں گا۔"

لیکن بوڑھے نے کھڑے ہی کھڑے آواز دی۔

"اری او انجے، پانی کا لوٹا بھر کرلے آ ماسٹر کے لیے۔"

دور گلی کے ایک گھر سے نہ جانے کس عورت نے جھانک کر دیکھا۔ بوڑھے نے دوبارہ وہی بات چلا کر کہی اور ہم دونوں پاٹھ شالا کے پاس چلے آئے۔ تحصیل کے ماسٹر جی نے مجھے چابی دے رکھی تھی۔ اس نے کہا تھا چارج لینے دینے کی قسم کا کوئی کام نہیں ہے۔ بچے ہی نہیں ہیں تو وہاں پاٹھ شالا کیا ہوگی۔ یہ چابی لے جاؤ۔ میں رپورٹ کرتا ہوں کہ چارج دے دیا۔

تالا کھول کر میں نے پاٹھ شالا کھولی۔ سڑی ہوئی ہوا کا جھونکا آیا۔ نیچے کی زمین اونچی نیچی اور اکھڑی ہوئی تھی جو دھول اور چڑیوں کی سفید بیٹ سے بھر گئی تھی۔

بوڑھے نے کمبل کاندھے سے اتار کر اُس سے اس کی صفائی کی۔ گرد اڑنے سے مجھے کھانسی آگئی۔ تھوڑی سی جگہ صاف ہو جانے پر بوڑھے نے وہاں کمبل بچھا دیا بلکہ یوں کہیے کہ بچھایا نہیں بس یوں ہی ڈال دیا اور کہا "بیٹھ جاؤ۔" اور پھر نیچے ہاتھ رکھ کر اس کے سہارے وہ بھی بیٹھ گیا۔ لکڑی کو ایک طرف ترچھی سی رکھتے ہوئے بولا "اب نکالو روٹی، چھوکری ابھی پانی لے آئے گی۔"

میں نے جھولا ہاتھ میں لیا۔ پرانی دھوتی کے ایک ٹکڑے میں بندھے ہوئے پراٹھے کھولے "بابا کیا آپ کھائیں گے؟"

اپنے جھرّیوں والے چہرے پر مسکراہٹ لا کر بوڑھا بولا "کیا ہم اب تک رہ سکتے ہیں؟ دوبار تو کھا چکا ہوں اور تیسری بار کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تو کھا۔"

مجھے کچھ جھجک سی محسوس ہوئی لیکن بھوک جھجک کو ماننے والی نہیں تھی۔ ایک کالے رنگ کی لڑکی آئی اور باہر سے ہی اس نے دہلیز پر پانی کا لوٹا رکھ دیا اور میری طرف ایک نظر ڈال کر چلی گئی۔

ایک گھٹنا کھڑا کر کے بیٹھا ہوا بوڑھا کمر سے تمباکو کا بٹوا نکال کر اس میں انگلیاں ڈالنے لگا۔ خالی پیٹ میں جلدی جلدی کھانا کھانے لگا اور کھاتے کھاتے اس بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔ اگر سر کے صافے اور آدھی دھوتی کو چھوڑ دیں تو اس کے بدن پر کچھ نہیں تھا۔ جس مٹی میں وہ دن بھر بھیڑوں کے پیچھے گھومتا ہوگا اس مٹی اور ان بھیڑوں کی طرح اس کا بھی رنگ گہرا کالا تھا۔ وہ مضبوط کاٹھی کا تھا۔ پیروں پر جھاڑیوں کے کانٹے وغیرہ لگنے سے خراشیں ابھری ہوئی تھیں۔ یہ سمجھیے کہ اب اس کا بڑھاپا بالکل پختہ ہو گیا تھا۔ کبوتر کے پروں کی طرح بھویں بالکل سفید، گھنی مونچھیں، انگل انگل بھر بڑھی ہوئی سفید ڈاڑھی، اور سینے پر سفید گھنگھریالے بال۔ عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن

بوڑھا بالکل تھک چکا تھا۔ چہرے پر جھریوں کا جال تھا۔ ہاتھ پیر کی نسیں پھولی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ ان میں گانٹھیں سی پڑی ہوئی تھیں۔

گالوں میں تمباکو دبا کر بٹوے کو ٹھیک سے باندھتے اس نے پوچھا

"تیرا گاؤں کہاں ہے؟"

میں نے کہا "یہیں پاس ہی ہے وِبھوت واڑی"

"وہاں کا کون ہے تو؟"

میں نے ضروری تفصیلات بتائیں۔ اس نے کسی کسی کی پہچان بتائی۔ "پھر تو ہم میں سے ہی ہے۔" ایسا کہہ کر اس نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور تھوکنے کے لیے بیٹھے ہی بیٹھے دہلیز کی طرف سرکا۔ مجھے کافی حوصلہ ہوا۔ اس گڈریوں کے گاؤں میں میں بالکل اکیلا نہیں ہوں۔ پاس آکر بات کرنے والا، اپنا پن جتانے والا کوئی نہ کوئی تو ہے۔ ایسے ہی دس پانچ آدمی نکل آئیں تو میرے لیے یہاں رہنا قابلِ برداشت ہو جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد مجھ سے رخصت ہو کر بوڑھا کھیت پر چلا گیا۔ میں اکیلا رہ گیا۔ پاٹھ شالا کے شہتیروں پر مجھ سے پہلے آنے والے ماسٹروں نے کھڑیا سے الگ الگ کہاوتیں لکھ رکھی تھیں۔ پورب پچھم کی سمت ان کے ناموں کی رنگین تختیاں بھی چپکی ہوئی تھیں۔ چھت سے لسوڑے کی ایک ٹہنی ٹنگی ہوئی تھی اس پر لیسوؤں کے جھنڈ بیٹھے ہوئے تھے۔ چھت کے جوڑوں میں جہاں جگہ ملی چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے ان میں سے سَن کی رسی کے ڈورے اور دھجیاں لٹک رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ایک میز، ایک کرسی اور ایک بورڈ۔ یہ تھا اسکول کا کل سامان اور میز سے لگا ہوا لکڑی کا ایک بکس رکھا تھا۔ اُسے کھول کر دیکھا تو اس میں بورڈ پونچھنے کا کپڑا، رول پرانا رجسٹر، حاضری بک، چاک کے خالی بکس، دوات، قلم وغیرہ تھے۔

جھولے سے اپنی چادر نکال کر میں نے نیچے بچھالی اور چھوٹے چھوٹے مچھروں سے بچنے کے لیے سر پر دھوتی اوڑھ کر سو گیا۔ اس طرح اکیلے پڑے رہنا کوئی بات نہیں تھی، لیکن جہاں کوئی آدمی ہی نہ ہو اور دھوپ گاؤں کو تل رہی ہو ایسے گاؤں اور اس خالی پاٹھ شالا میں میں کچھ زیادہ ہی تنہا ہو گیا تھا۔ چڑیاں چلا رہی تھیں۔ ایک آدھ چڑیا چوں چوں کرے تو سننا اچھا لگتا ہے لیکن آٹھ دس چڑیاں لگاتار چلائیں اور پھڑ پھڑانے لگیں تو ناک میں دم آجاتا ہے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ دروازہ بند کرنے پر بھی دیوار کے اوپر سے اندر آنے کا راستہ تھا۔ میں

آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ پیدل سفر کی مشقت برداشت کی اور اس کے بعد کھانا کھایا، دھوپ کے بعد سایہ ملا۔ ان وجہوں سے میں گہری نیند سو گیا۔

(۳)

جب میں اس گہری نیند سے جاگا اور پڑے پڑے ہی کھلے دروازے سے میں نے سامنے دیکھا تو دن پوری طرح ڈوب چکا تھا۔ جنگل سے واپس آنے والی بھیڑوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں بہت دیر سو چکا تھا لیکن اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا کیوں کہ میرے پیر بے حد دکھ رہے تھے۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر شہتیروں کی طرف دیکھتے ہوئے میں پڑا ہی رہا۔

باہر بھیڑوں کا شور بڑھتا ہی چلا گیا۔ گڈریوں کی اونچی آوازیں دور اور نزدیک سے سنائی دے رہی تھیں۔ ان کے کتّے بھونک رہے تھے، مُرغے بانگ دے رہے تھے، آدمی باتیں کر رہے تھے، چڑیاں اور کوّے شور مچا رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے دوپہر کو بے جان لگنے والا گاؤں یکایک جیتا جاگتا گاؤں ہو گیا اور ایک عجیب جوش سے بھر گیا۔

میں باہر آیا اور میدان میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ جس راہ سے میں آیا تھا یا وہ بھالے والا آیا تھا اور اس کے بعد وہ بوڑھا آیا تھا وہ سارا راستہ آنے والی بھیڑ سے بھر گیا تھا۔ گردن نیچے جھکائے جانور جلدی جلدی چل رہے تھے۔ ان کے پیروں کی مدھم سی آواز آ رہی تھی اور دھول اڑ رہی تھی دھول پر سیکڑوں کھُر ابھر رہے تھے اور دھوتی تھامے ہوئے کالے کلوٹے گڈریے کندھوں پر آڑی لکڑی لیے، منھ سے عجیب آواز نکالتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ان بھیڑوں کے ریلے میں بکریاں بھی تھیں اور کتّے بھی۔

مغرب کی طرف آسمان شفق آلود ہو گیا تھا۔ ہوا کا رُخ پورب کی طرف تھا۔ سفید بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سُرخ پچھم سے نیلے کالے پورب کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ زمین کی طرح آسمان پر بھی سفید بھیڑیں باڑے کی طرف جا رہی تھیں۔ بچے والی بھیڑیں تیز بھاگتی آئیں چوں کہ ان کے آٹھ آٹھ دس دس دن کے بچے گھر پر رہ گئے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے اور اپنے جسم کو تولتے ہوئے چلنے لگے۔ پتلی گلابی زبانیں نکال کر باریک آواز میں چلانے لگے اور بھیڑوں کے ریوڑ کے آتے ہی اپنی ماؤں کی کوکھ میں گھس کر سر سے ٹکر مارنے لگے۔

جنگل سے آئی ہوئی گڈرنیوں نے گھروں میں چولھے جلائے۔ پھوس کے چھپروں میں سے

دھواں آسمان کی طرف چڑھنے لگا۔ گڈریے بھیڑوں کو بند کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔

دیکھتے دیکھتے گھُپ اندھیرا ہو گیا۔ بھیڑوں کا شور، چڑیوں اور کووں کا غل اور آدمیوں کی ہنکار غرضیکہ سب کچھ ختم ہو گیا۔

پاٹھ شالا کے باہر چبوترے پر میں پیر لٹکائے بیٹھا رہا۔ اوپر تارے چمک رہے تھے، نیچے دیے جھلملا رہے تھے اور ہوا کے ٹھنڈے جھونکے آ رہے تھے۔

اندھیرے میں کوئی آیا اور قریب ہی ہنومان جی کے چھوٹے مندر میں دیا جلا کر چلا گیا۔ اُس احاطے میں جا کر روٹی کھالوں اور پانی کے اس لوٹے سے بچا ہوا پانی پی لوں جو وہ چھوکری دے گئی تھی۔ یہ خیال میرے من میں اٹھا مگر جسم نے اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ کھمبے کے نچلے حصے سے ٹیک لگا کر میں اس اندھیرے کو دیکھتے ہوئے بیٹھا ہی رہا۔

اب سے لے کر تین سال تک یہی میرا گاؤں ہوگا۔ یہیں مجھے رہنا تھا۔ یہیں کے لوگوں میں گھل مل کر مجھے زندگی گزارنی تھی۔ ان کا اعتماد اور ان کی محبت حاصل کر کے عزت حاصل کرنی تھی اور یہ سب کرتے کرتے اس برباد شدہ اور چڑیوں کی بیٹ سے آلودہ اور کیڑوں اور مچھروں کی بدبو سے بھری ہوئی پاٹھ شالا کو سنوارنا تھا۔

بچوں کو اکٹھا کرنا، ان میں تعلیم کا شوق پیدا کرنا، خود گاؤں میں رہنا اور باعزت رہنا ضروری تھا۔ مگر میرا دبلا پتلا جسم اور چھوٹی عمر ان باتوں کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھی اور یہ ایسا گنوار گاؤں تھا کہ پانچ دس لڑکے بھی باقاعدگی سے پاٹھ شالا میں شاید نہیں آئیں۔ یہ سب کچھ کیسے ہوگا اور کیسے نبھے گا۔

سامنے پیروں کی آہٹ ہوئی۔ ہنومان جی کے مندر کے دیے کی مدھم پیلی اور لال روشنی باہر جا رہی تھی۔ مجھے اس مندر میں کوئی کالا جسم دکھائی دیا۔ یوں تو مجھے اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف یہی نظر آیا کہ کوئی پاس آیا ہے۔ میں کچھ سہم گیا۔

"کون؟ ماسٹر بیٹھا ہے کیا؟"

میں نے بوڑھے بابا کی آواز پہچان لی

"ہاں، آئیے"

"روٹی کھالی کیا؟"

"نہیں، اب نہیں کھاؤں گا۔"

"دیکھو! یہ بکری کا دودھ لایا ہوں۔"

چبوترے پر برتن رکھنے کی آواز میں نے سُنی۔ میں نے اس طرف ہاتھ آگے بڑھایا تو ہاتھ برتن سے جالگا۔ اس درمیان میں اور کوئی اندھیرے میں آیا اور کھانس کھونس کر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

بوڑھے نے پوچھا:

"کون ہے؟"

"میں ہوں مکھیا جی۔"

"آنندا!"

"ارے کم بخت! ماسٹر اندھیرے میں بیٹھا ہے گھر جاکر لالٹین تو لے آ۔"

"کون ماسٹر؟"

بوڑھے کو شروع سے سب کچھ بتانا پڑا۔ کون ماسٹر، کس لیے آیا ہے، کب آیا ہے، کہاں کا ہے اور کس کا کون ہے۔ ان سب باتوں کے جواب مکھیا نے دیے اور آنندا نے سُنے اور پھر وہ لمپ لانے گیا۔ لوٹا، گلاس، دیا، بستر۔ یہ سب چیزیں نہایت ضروری تھیں۔ مجھے چاہیے تھا کہ آتے وقت لیتا آتا مگر دھیان ہی نہیں آیا۔

آنندا راموشی لیمپ لانے چلا گیا۔ اس کے واپس آنے تک دس بارہ آدمی آئے اور کمبل بچھا کر نیچے زمین پر ہی بیٹھ گئے۔ باتوں ہی سے انھوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔ کسی ایک کی بھیڑ بھیڑیے نے مار ڈالی تھی۔ اس کی تفصیل بیان کی گئی۔ بھیڑیے کی بھیڑنی نے کسی جھاڑی میں بچے دیے ہیں۔ اس کا ٹھکانا وہاں ہے۔ رات کو جاکر مار ڈالیں تو مصیبت سے چھٹکارا ملے گا۔ یہ سب باتیں کی گئیں۔ کسی نے اس کی ہنسی اڑائی۔ ایک کی یہ رائے تھی کہ جانور ایسے نہیں ملے گا۔ وہ ہمیشہ گھومتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد کوئی یہ خبر لایا کہ بھیڑ بھیڑیے نے نہیں بلکہ کتے نے مار ڈالی تھی۔ وہ کتا فلاں فلاں کا ہے اور فلاں فلاں نے دیکھا تھا۔

صافے کا سرا آڑا پکڑ کر آنندا راموشی لیمپ لے آیا۔ اس روشنی میں مجھے دکھائی دیا کہ بارہ سے زیادہ آدمی دھول میں ہی بیٹھے تھے لیکن سب ہی کے بدن پر انگرکھے نہیں تھے البتہ موٹے کمبل سب کے پاس تھے۔ کسی نے اسے موڑ مار کر نیچے بچھا لیا تھا تو کسی نے اُسے بدن پر ڈال رکھا تھا۔ اکا دکا ہی کوئی کمبل لپیٹ کر بیٹھا تھا۔

پاٹھ شالا میں جاکر میں نے آنندا کے لائے ہوئے لمپ کی روشنی میں کھانا کھالیا اور مکھیا

نے پوچھا "کھالی روٹی ؟"

میں نے کہا "ہاں ۔"

کھانسنے کھکھارنے سے پتہ چلا کہ سبھا ابھی جمی ہوئی ہے ۔ ایک بار تو یہ چاہا کہ اندر کا لمپ باہر لے آؤں مگر ہوا کے مارے وہ رہتا نہیں تھا اور میرے سوا کسی اور کو اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی ۔ میرے پاس بیٹھا ہوا 'بچہ' کہہ کر بات کرنے والا وہ عمر رسیدہ بوڑھا گاؤں کا مکھیا ہے ۔ یہ بات مجھے اب تک معلوم ہو چکی تھی ۔ لوگ اس سے بات مکھیا جی کہہ کر کرتے تھے ۔ نظر نہ آنے والی سبھا کو مخاطب کر کے مکھیا بولا " ارے ماسٹر آیا ہے کل بچوں کو پاٹھ شالا میں بھیجو ۔"

کسی نے کھنکار کر تھوکا ۔

ہلکی آواز میں کوئی اپنے قریب بیٹھے ہوئے سے بولا " گاؤں میں بچے ہیں کہاں ؟"

بوڑھے نے ذرا اونچی آواز سے کہا " تو کیا گاؤں کا گاؤں بانجھ ہے ؟"

"ایسی بات نہیں مگر پاٹھ شالا میں آنے کے لیے خالی بچّے ہیں کہاں ؟"

"ایک بھی نہیں ہے ؟ تو یہ کہو سب کام میں لگے ہوئے ہیں ۔"

"ہیں ، مگر بھیڑیں چرانے ، بکریاں چرانے جاتے ہیں ، خالی کون ہے ۔"

تھوڑی دیر تک الٹے سیدھے سوال و جواب کا شور ہوتا رہا ۔ پھر میں نے کہا

" چھ سال سے بڑے جو بچے بکریاں چرانے جاتے ہیں وہ کیا اکیلے جاتے ہیں ؟"

" کہاں جاتے ہیں ۔ بڑے بھائی کے پیچھے جنگل میں گھومتے ہیں ۔ چھوٹے ہوں تو دو تین مل کر بکریوں کے ساتھ جاتے ہیں ۔"

" پھر جو ایسے بچے ہیں انھیں بھیجیے ۔ انھیں پڑھنا لکھنا آجائے گا تو کوئی نقصان نہیں ہوگا فائدہ ہی ہوگا ۔"

دور سے تمباکو بھرے منھ سے آواز آئی " ان کے پیٹ کے لیے ؟"

مجھے تھوڑی دیر تک تو جواب نہیں سوجھا ۔ بچّے اسکول میں آئے تو ان کا پیٹ کون کیسے بھرے گا ۔ اس سوال کا احساس مجھے کبھی نہیں ہوا تھا ۔ میرا خیال تھا کہ چھوٹے بچوں کو ماں باپ کما کر کھلاتے ہیں لیکن بوڑھے نے خود ہی جواب دیا ۔ وہ بولا بھوکوں مرنے لگیں تو میرے گھر آجانا ۔ سیر سوا سیر جوار دے دوں گا ۔ نکمّے کہیں کے ، جس کام میں دیکھو اڑنگے لگاتے ہیں ۔ پنت سرکار نے اچھی بھلی پاٹھ شالا دی ، ماسٹر دیا ، سیکھنے میں جاتا کیا ہے تمھارا ؟"

بس اس کے بعد سب کا سُر بدلا۔ کون کون بچے بھیج سکے گا، اس کا ذکر ہوا۔ ہمارا دسرا، آئے گا، ہمارا بُھادا آئے گا، آپ کا ڈُنکا، آئے گا، ان کا سُکھا آئے گا۔ ایسا کرتے کرتے دس بارہ بچے اکٹھے ہو گئے۔

مکھیا بولا "کہو ماسٹر! ہوگئی تیرے من کی بات، کل سے کام میں لگ جا۔" اس طرح یہ ساری بحث ختم ہو گئی۔ اسی درمیان میں کچھ لوگ گھر ہو آئے تھے۔ میں یہ سوچ کر بیٹھا تھا کہ اب جاتے ہیں مگر اِدھر اُدھر کی باتیں چل پڑیں۔ بارش، پانی، چراگاہ، بھیڑیں اور پھر اپنی اپنی باتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے چپکے سے مکھیا سے کہا "اچھا تو کیا میں لیٹوں؟"

"ہاں۔ ہاں۔ لیٹ۔ بچے صبح آئیں گے، فکر نہ کر۔"

اندر جاکر میں نے چادر بچھائی اور دھوتی اوڑھ کر لیٹ گیا۔ لمپ بجھا دیا تھا۔ باہر ابھی باتیں چل رہی تھیں۔ میری آنکھ لگ گئی۔

بیچ میں آنکھ کھلی تو باہر چاند نکل آیا تھا اور منڈلی کے کچھ لوگ پڑاؤ میں، تو کچھ اس میدان میں جہاں بیٹھے تھے وہیں نیچے اوپر کمبل لے کر پڑ رہے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ خوب صورت چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں کافی دیر باہر کھڑا رہا۔ گاؤں کے کنارے سامنے کی طرف ذرا دو کم اونچے چھپر تھے، ان کا سایہ نظر آرہا تھا۔ نیچے کی گلی سے پار پتھر سے چُنا ہوا ایک تالاب سا دکھائی دے رہا تھا اس کے پار کُھلا جنگل تھا، دور تک پھیلا ہوا جنگل اور دور دھندلے نظر آنے والے درختوں کے جھنڈ جہاں میں دوپہر کے وقت آبیٹھا تھا۔ وہ نیم کا پیڑ خاموش کھڑا تھا۔ اس کی ٹہنی پر چار سفید بگلے خاموش بیٹھے تھے۔

(۴)

مجھے آئے دس پندرہ دن ہو چکے تھے۔ ابھی تک بچے پاٹھ شالا میں نہیں آرہے تھے۔ پاٹھ شالا باقاعدہ لگ نہیں رہی تھی۔ کبھی کسی دن دو تین بچے آجاتے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر جانے پر اوب جاتے۔ پیشاب کا بہانہ کر کے باہر جاتے اور لوٹ کر نہ آتے۔ ان میں سے ایک آدھ باقاعدہ آنے لگتا تو کبھی باپ کبھی ماں آکر روٹی کھانے کے بہانے بلا کر لے جاتی اور پھر اُسے بکریاں چرانے کے لیے جنگل میں بھیج دیا جاتا۔ باقاعدہ نہ آنے پر اگر کبھی کسی بچے کو ڈانٹتا تو وہ رونے لگتا اور گھر سے اس کی ماں دوڑ کر آتی "ارے بابا، تیرے بال بچے نہیں ہیں! مٹی میں مل جائے تیری پاٹھ شالا

چل بیٹا، تو گھر چل!" ایسا کہہ کر بچے کا ہاتھ پکڑ کر چل دیتی۔ اس طرح چل رہی تھی پاٹھ شالا۔

لوگ روز پڑاؤ کے سامنے والے میدان میں اکٹھے ہوتے۔ ان کے سامنے بات ہوتی تو کہتے "ابھی بچّوں کی عادت نہیں ہے۔ پندرہ بیس دن گزرنے دو"

ان کی یہ بات ماننے کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

اس درمیان میں مکھیا جی نے مجھے ایک چھوٹا سا مکان دے دیا۔ اس میں مَیں نے اپنی گرہستی جمائی۔ مطلب یہ کر پتھر چُن کر چولھا بنایا۔ اتوار کو گاؤں جاکر برتن لے آیا اور ہاتھ سے پکا کر کھانے لگا۔

ایک دن رات کو بھالا لے کر دادو آیا۔ میں لیمپ کی روشنی میں بستر کے سہارے یوں ہی بیٹھا تھا۔ وہ آیا اور دری پر ذرا چوڑا ہو کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ میں جو بھالا تھا اُسے دیوار کے کونے میں رکھ کر بولا "تو کہو کر تیرے حصے میں یہی جگہ آئی؟"

اب تک ان لوگوں کی پھوہڑ بول چال کی مجھے عادت ہوگئی تھی۔ عزّت سے صیغۂ جمع میں بات کرنے سے وہ واقف ہی نہیں تھے۔ لیکن اگر وہ محبت اور بے تکلفی کی وجہ سے ہو تو کانوں کو برا بھی نہیں لگتا مگر کوئی بھی اجنبی گڈریا "کیوں رے ماسٹر" کہتا تو مجھے بُرا لگتا تھا۔ خاص کر دادو کا ایسا کہنا مجھے بہت کھلا۔ اس نے جیب سے چلم نکال کر اس میں تمباکو بھرا۔ اس خیال سے کہ چلم گرے نہیں اس نے پیر کے انگوٹھے اور اس کے پاس والی انگلی کے بیچ سیدھی چلم پکڑ رکھی تھی اور خالی ہاتھوں سے چقماق سے اس نے گُل سلگایا۔ جلتا ہوا گل چلم پر رکھ کر پھکا پھک چھوٹے کش لگائے اور پھر دھوئیں کا بادل چھوڑا۔ پیٹ میں اترے ہوئے تیز دھوئیں کی وجہ سے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

پہلی ملاقات ہی سے میرے من میں اس آدمی کے لیے ایک گرہ سی پڑ گئی تھی۔ مزید پوچھ تاچھ کرنے پر پتہ چلا کہ یہ آدمی صرف بے کاری کے سہارے جیتا ہے۔ گاؤں کے لوگوں پر وہ بھاری تھا۔ تحصیل کے عہدے داروں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتا تھا اس لیے گاؤں والے اکثر اس سے صلاح لے لیتے تھے۔

ناک سے دھواں چھوڑتے ہوئے اس نے چلم بجھا دی اور کمرے پر نظر گھما کر بولا۔ تجھ سے پہلے جو ماسٹر تھا وہ بھی اسی کمرے میں رہتا تھا۔ اس ماسٹر نے گاؤں میں کچھ غلط سلط کام کیا تھا اس لیے وہ پٹتا گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے اسے بے حد مارا تھا۔ یہ بات میں نے بھی اڑتی اڑتی سُنی تھی۔ یہ بات سنتے ہی میرے دل میں خوف کی ایک ٹیس سی اٹھی۔ پھر بھی چہرے سے کچھ نہ ظاہر کرتے

ہوئے میں نے کہا "اچھا؟" لیکن میری آواز ڈری ہوئی بھیڑ کی آواز کی طرح تھی۔

"ڈھنگ سے نوکری کرنے کی بجائے گاؤں میں غنڈہ گردی کرنے لگا۔ ہمارے چولہوں تک جا پہنچا۔ میں نے دو چار بار اُسے تنبیہہ بھی کی اور کہا کہ ہماری عورتوں اور بہو بیٹیوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر ہرگز نہ دیکھو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا مگر اس نے میری بات ان سُنی کر دی۔ اسے ایسا لگا کہ وہ تو سرکاری نوکر ہے۔ یہ مورکھ گڈریے اس کا کیا بگاڑ لیں گے، اسی وجہ سے وہ مفت میں مارا گیا۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنا بے ڈھنگا چہرہ خوشی سے چمکا لیا اور اپنی لال آنکھیں مجھ پر ڈالیں میں ڈر سا گیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کونے میں رکھا ہوا بھالا اس نے اپنے قریب رکھ لیا اور پھر کہا "وہ ایسے ہی بیٹھا تھا اور یہی وقت تھا، میں آیا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھے یہ بھالا الٹا کر کے اسے اس وقت تک پیٹتا رہا جب تک کہ وہ گر نہیں پڑا۔ اس کی دھوتی گیلی ہو گئی تھی۔ میرے پاؤں پڑنے لگا مگر میں تو غصے میں تھا۔ دس پانچ ہاتھ مارنے کے بعد جب وہ زمین پر مردے کی طرح لیٹ گیا تو میں نے کہا چپ چاپ بچوں کو پڑھاؤ۔ غنڈہ گردی کروگے تو جان سے مار دوں گا۔"

لیمپ کی روشنی کانا پھوسی کرنے والے کے اس چہرے پر پڑ رہی تھی جس کی ہڈیاں جھکی ہوئی تھیں۔ مونچھیں بکھری ہوئی تھیں اور وہ ہونٹ جو اس نے دانتوں تلے دبا رکھا تھا، بیڑی سے کالا ہو چکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔ انجانے میں ہی ہی کر کے میں ہنس دیا اور دروازے کی طرف دیکھا۔ میں چاہتا تھا کہ ایسے میں کوئی آجائے مگر باہر گھنا اندھیرا تھا۔

مونچھیں جماتے ہوئے دادو بولا "ہنس مت ماسٹر! ہنسی کی بات نہیں ہے۔ تو نیا آیا ہے۔ اپنا کام اچھی طرح کر۔ گاؤں کی باتوں میں ٹانگ نہ اڑا۔ پاٹھ شالا میں بچے آئیں تو ان کو پڑھا۔ گاؤں بھر کو سکھانے کے جھنجھٹ میں نہ پڑنا۔"

زمین پر رکھی ہوئی چلم، چھاپی اور چقماق کو اٹھا کر اس نے کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔ بھالا اٹھایا اور سینہ تان کر باہر نکل کر اندھیرے میں غایب ہو گیا۔

کچھ دیر تو میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میرے ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔ سانس رُک رُک کر چل رہی تھی۔ دل میں خیال آیا کہ جھٹ اٹھ کر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دوں لیکن یہ کام مجھ سے نہ ہو سکا۔ میں کمرے میں اوندھا لیٹ گیا۔

کچھ لمحات گزرے تو مجھے ایسا لگا کہ دروازے سے کوئی اندر آیا ہے۔ میری گردن کے بال کھڑے ہو گئے۔ ڈر کی سنسنی ریڑھ کی ہڈی تک دوڑ گئی۔ جھٹ سے اٹھ بیٹھا اور سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔

باہر کے اندھیرے میں کوئی بیس بائیس سال کا ہٹا کٹا آدمی اندر آیا اور دہلیز کے پاس دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ میں اُسے پہچانتا نہیں تھا۔ آج تک میں نے اُسے گاؤں میں دیکھا ہی نہیں تھا۔ پھٹی ہوئی آواز میں میں نے پوچھا "کون ہے؟"

"میں آیبو۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بارش سے بھیگے ہوئے کتے کی طرح اندر آکر بیٹھنے والا یہ آیبو کون ہے۔ یہ بات میرے دھیان میں جلدی سے نہیں آئی لیکن وہ گھٹنے اونچے کرکے اور انھیں ہاتھوں سے جکڑ کر چپ بیٹھا تھا۔ پھر اس نے منھ موڑ کر میری طرف دیکھا۔ لیمپ کے اجالے میں اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر میں نے کہا۔ "کیا تم یہیں کے ہو؟"

"نہیں ایکھت پور کا ہوں۔"

"ایکھت پور؟ کافی دور سے ادھر آئے ہو؟ کس کے یہاں ٹھہرے ہو؟"

آیبو نے سر سے ٹوپی اتاری اور نیچے رکھ دی۔ دونوں ہتھیلیاں جوڑ کر سارے کمرے پر نظر ڈالی اور کہا

"میرے گھر پر کوئی نہیں ہے۔ پیٹ کے لیے گاؤں گاؤں بھٹکتا ہوں۔ آج یہاں آگیا۔ پاٹھ شالا کے باہر لوگوں نے کہا ماسٹر اکیلا ہے جاؤ! اس کا ساتھ دو، اس لیے آگیا۔"

اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میری اس کی واقفیت بہت دنوں کی، بہت سال کی ہے پھولے ہوئے گال اور لال ناک والا یہ آیبو کیوں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ مجھے یہ سوچنا نہیں پڑا کہ کیسے جیتا ہوگا۔

تو نے گاؤں کیسے چھوڑا، ٹھیک یہاں کیسے آیا، کہاں رہے گا، بدن پر پہنے ہوئے کپڑوں کے علاوہ تیرے پاس اور کچھ بھی نہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

یہ سوال مجھے پوچھنے نہیں پڑے۔ بدن پر تار تار کرتہ اور مسلمانوں کا سا پاجامہ پہنے ہوئے آیبو کی اور میری زیادہ بات چیت ہوئی ہی نہیں۔ صبح کے ناشتے کے لیے رکھی ہوئی ایک روٹی میں نے نکالی، اس پر تھوڑا سا سالن اور تیل ڈالا اور وہ اس کے ہاتھ میں دے دی۔

جیسے بیٹھا تھا اسی حالت میں اس نے ایک ہاتھ میں روٹی لی اور دیکھتے دیکھتے صاف کر ڈالی۔ چپ چپ کرنے والا اس کا منھ چپ ہوگیا۔ لوٹا بھر کر دیا اور وہ چلو سے پانی پی گیا۔ دہلیز سے نیچے اتر کر کلی کر آیا۔ دیوار سے لگا کر اس نے وہ خالی لوٹا اٹھا کر کے رکھ دیا۔

اور آستین سے منھ پونچھ کر یوں ہی اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بیٹھا رہا۔

چھت کی طرف دیکھتے ہوئے میں بھی لیٹے ہوئے بستر کا سہارا لے کر پانچ چھ منٹ تک بیٹھا رہا۔

آیبو کی بھاری سانس سنائی دینے لگی۔ اسی عالم میں گھٹنوں میں سر ڈال کر وہ سوگیا۔ آسرا ملا، پانی پینے کے لیے تھوڑی سی روٹی ملی اور اسے گہری نیند آگئی۔ میں نے نیچے کا کمبل نکال کر اس کی طرف پھینکا۔ بدن پر کمبل پڑتے ہی وہ جاگ اٹھا۔ بھاری آنکھوں سے اس نے ایک بار میری طرف اور ایک بار کمبل کی طرف دیکھا۔ میں چادر بچھا کر اس پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے کمبل لے لیا۔ آدھا حصہ نیچے بچھایا، آدھا اوپر اوڑھ لیا اور بلی جیسے دودھ چاول کھا کر سوتی ہے، آیبو ویسے ہی سوگیا اور دھیرے دھیرے خرّاٹے بھرنے لگا۔ میں نے دل میں یہ طے کیا کہ بھالے والے سے اب بالکل نہیں دبوں گا۔ میں بنیادی طور پر ڈرپوک نہیں تھا۔ بیتے ہوئے دنوں میں مجھے کئی بُرے بھلے تجربے ہوئے تھے۔ معمولی بچہ شاید ہی اس زندگی کو سمجھ سکے جسے میں گزار چکا تھا۔ لیکن اس عزّت سے یہ تجربہ بالکل مختلف تھا۔ اسی لیے میں یکایک گھبرا گیا لیکن اس گھبراہٹ کے ردعمل کی وجہ سے مجھ میں بہت بے خوفی آگئی تھی اور ہوا آنے کے لیے دروازہ کھُلا چھوڑ کر آیبو کی طرح ہی سے بے فکر ہو کر میں بھی گہری نیند سوگیا۔

(۵)

بنگرواڑی کی زیادہ تر بستی غریب آدمیوں کی تھی۔ یہ کالے کلوٹے گڈریے ہمیشہ ننگے بدن ہی رہتے۔ باہر کی دنیا سے متعلق انھیں کوئی خاص واقفیت نہ تھی۔ بڑے سویرے اٹھتے اور رات بھر کی باڑے میں بند بھیڑوں کو لے کر واڑی کے باہر نکل جاتے۔ کوئی تین میل کے فاصلے پر ایک چراگاہ تھی، جس میں کافی ہری ہری گھاس تھی۔ بھیڑوں کو لے کر ادھر اُدھر نکل جاتے تھے۔ سُو سُو بھیڑوں کے پیچھے ایک گڈریا اور ایک کتّا ہوتا تھا۔ گردن نیچی کیے بھیڑوں کا جھنڈ لگاتار حرکت میں رہتا۔ کئی قسم کی گھاس کے بیج ان کی اون سے چپک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتے اور جگہ جگہ گر پڑتے۔ اس سے بھیڑوں کے کھانے کے لیے آیندہ سال گھاس پیدا ہوتی۔ کندھے پر لٹھیا رکھ کر گڈریا بھیڑوں کے پیچھے گھومتا رہتا۔ چلچلاتی دھوپ میں دن بھر تپتا مگر آرام نہ کرسکتا۔ اس کا کتّا بھی اوب جاتا۔ ٹنا ٹن کی آواز سے کودنے والی ٹڈی کا پیچھا کرتا، کالے گرگٹ کے پیچھے لپکتا اور بلا وجہ بھونکتا، کچھ اس

طرح کی حرکتیں کر کے وہ اپنی بے زاری کو دور کرتا۔ گڈریے کا بھی یہی حال تھا۔ کبھی کسی تیز بھیڑ کو منتخب کر کے اس کے گلے میں گھنگرو باندھتا، روٹی کھانے بیٹھتا تو ایک ٹکڑا اس کے منھ میں بھی دے دیتا۔ کھڑی فصل نظر آتی تو ایک دو ملائم بھٹے توڑ کر کھلا دیتا۔ اسی سلوک کی وجہ سے وہ بھیڑ کتے کی طرح اس کے پیچھے رہتی۔ اتنی باتیں ہو جانے کے بعد جب دوسری بھیڑیں چرنے لگتیں تو وہ دل بہلانے کے لیے اس بھیڑ کو لکڑی کے اوپر سے چھلانگ مارنا سکھاتا اور اسے ایسی عادت ڈالتا کہ 'بیٹھ' کہتے ہی وہ بیٹھ جائے اور 'اٹھ' کہتے ہی وہ اٹھ جائے۔ کبھی اسی کلہاڑی سے ببول کی لکڑی کاٹ کر چھیلتا رہتا جو ہمیشہ اس کے ہاتھ میں رہتی تھی اور کبھی جال لگا کر کبوتر پکڑتا۔ بھیڑیں چرا کرتیں اور چرانے والے ایسا کچھ کر کے وقت کاٹتے تھے۔

لیکن ایسے اکیلے پن کے موقعے کبھی کبھی ہی آتے تھے کیوں کہ اکثر تین چار گڈریے مل کر اپنے ریوڑ چراتے تھے۔ دوپہر ہونے پر باری باری کنوئیں پر جا کر نہا آتے۔ جوں جوں دھوپ چڑھتی بھیڑیں بھی تھک کر پانی کی طرف جانے لگتیں۔ سوکھے ہوئے نالے کی سبز کائی کے نیچے کا پانی پی کر بھیڑیں بہت مست ہو جاتیں اور جہاں سایہ ملتا وہیں کھڑی رہتیں۔ اس وقت گڈریے بھی سایہ ڈھونڈ لیتے اور اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ کھانا کھا چکنے کے بعد ایک آدھ گڈریا نگرانی کے لیے جاگتا رہتا اور باقی کے دو تین کمبل کو لپیٹ لپاٹ کر سرہانے رکھ لیتے اور صافے کے سرے سے منھ ڈھانک کر اونگھنے لگتے۔ ان کے کتے ٹھنڈی گیلی ریت میں لوٹ کر ہانپتے رہتے۔ جب دن تھوڑا رہ جاتا تو گڈریے بھیڑوں کو گاؤں کی طرف موڑتے۔ اونچے میدان پر جو بھی کھانے کو مل جاتا اُسے چباتے اور جُگالی کرتے کرتے گاؤں تک پہنچنے میں انھیں شام ہو جاتی۔ گاؤں کے قریب آتے ہی ایک گڈریا الگ کھڑا ہو جاتا اور اپنی بھیڑوں کو بُلا لیتا۔ اس طرح ایک ریوڑ کے تین ریوڑ ہو جاتے۔

خاوند کے جانے کے بعد گھر پر رہ کر چرخے یا تکلی پر اُون کاتنے والی عورتیں بھیڑوں کے آتے ہی جلد جلد اٹھ جاتیں۔ بند کر کے رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے میمنوں کو کھول دیتیں اور لکڑی کی چار ٹہنیاں چولھے میں ڈال کر آگ جلاتیں۔ اس وقت تک اکثر اندھیرا ہو چکا ہوتا تھا۔ سب کے گھر دیا سلائی کی ڈبیا نہیں ہوتی تھی۔ عورتیں اپنے دیے لے جا کر پڑوسن کے دیے سے جلا لاتیں اور چولھا سلگا کر گرم روٹیاں سینکتیں۔

واپس آنے کے بعد گڈریوں کے لیے بھیڑوں کی پہچان کا کام کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا کام ہوتا تھا۔ گھر پر بندھے ہوئے میمنوں اور جنگل سے آئی ہوئی بھیڑوں کے ملنے سے ایک ہنگامہ مچ جاتا۔

ماں بچے کو کھوجتی رہتی اور بچہ ماں کو پکارتا رہتا۔ بھیں بھیں۔ بیں بیں کا بھاری شور مچتا۔ بھوکے بچے کسی بھی بھیڑ کی کوکھ میں گھس کر سر مارنے لگتے۔ ماں کو اس اجنبی لمس کا پتہ چل جاتا اور وہ کود کر ایک طرف ہو جانے کی کوشش کرتی۔ اس سٹ پٹاہٹ میں چھوٹے بچے لڑھک جاتے اور پیٹھ کے بل گر پڑتے۔ بچے کے لیے پاگل بنی ہوئی بھیڑ کی لاتیں اس کے منھ اور آنکھوں پر پڑتیں۔ سارے گاؤں میں یہ گڑبڑ چلتی رہتی۔ ہزار بارہ سو بھیڑیں اور ان کے دو چار سو بچوں کی آوازیں اٹھتی رہتیں اور گڈریوں اور ان کی بیویوں کو سیدھی سادی باتیں بھی چلّا کر کرنی پڑتی تھیں۔ بھیڑوں کے شور میں یہ چلّانا بھی شامل ہو جاتا۔

ہوا سنسناتی ہوئی چلتی رہتی۔ چڑیاں اور کوے شور مچاتے۔ بھیڑوں کی مینگنیوں اور پیشاب کی بدبو ہوا کے جھونکوں سے چاروں طرف پھیلتی رہتی۔ بھیڑوں کی اس گڑبڑ میں گڈریوں کو بھیڑیں پہچاننی پڑتی تھیں۔ اس گنگا کا یہ میمنا، اس بھوری کے یہ کالے بچے۔ بھٹکے ہوئے میمنوں کی پچھلی ایک ٹانگ پکڑ کر وہ انھیں چلا کر ماں کے پاس لے جاتے اور کوکھ میں لگا دیتے۔ یہ سارا معاملہ کوئی آدھ گھنٹے تک چلتا رہتا۔ اس کے بعد شور دب جاتا اور صرف دودھ پیتے بچوں کی پچ پچ کی آواز ہی سنائی دیتی۔ بچوں کے دھول سے لتھڑے ہوئے جسموں کو بھیڑیں چاٹتیں اور سفید گاڑھے دودھ سے ان کے منھ بھر جاتے۔

چبوترے کے پاس ایک دوسرے سے ملنے والے گڈریے پوچھتے "مل گئیں بھیڑیں؟"

"ہاں"

"تیری؟"

"مل گئیں۔"

اس درمیان میں گڈریائنیں چار روٹیاں سینک لیتی تھیں۔ ساتھ کے لیے پتیلی میں مونگ موٹھ کی دال کھولتی رہتی۔ بھیڑوں کو جمع کر کے گڈریا گھر جاتا اور صبح سے اس کے ہاتھ کی کھڑی لاٹھی اب آڑی ہو جاتی۔ کلّا کر کے وہ اکڑوں بیٹھ جاتا اور ادھوری روشنی میں روٹی کھانے لگتا۔ کھانا یا بھوجن۔ یہ لفظ یہ لوگ جانتے ہی نہیں۔ صرف روٹی کھانا ہی کہنا چاہیے۔ کھانا کہنے پر شاید اس میں ایک آدھ اور چیز کا تصور بھی آ جاتا ہے اور گڈریے اس سے قطعی ناواقف تھے۔ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ صرف دو بار روٹی کھاتے ہیں۔ ترکاریوں کے ہرے پتوں، پیاز، چٹکی بھر چٹنی یا نمک کے ساتھ۔ دن بھر کڑی محنت کر کے یہ لوگ صرف روٹی کھاتے ہیں۔

روٹی کھا لینے کے بعد دن بھر بھاگا دوڑی کرنے والے گڈریوں کے ہاتھ پاؤں میں ذرا جان آجاتی تھی اور وہ کمبل لے کر گھر سے باہر نکلتا۔ گھڑی بھر پڑاؤ میں بیٹھ کر گپ ہانکتا اور پھر باڑے کے پاس جاکر پڑ رہتا۔ اس کا وفادار کتا بدن سکیڑ کر اس کے پیروں کے پاس بیٹھتا۔ باڑے میں بھیڑیں سوتی تھیں، گھر میں گڈریائنیں اپنے چھوٹے بچے کو لے کر سوتی تھیں اور باڑے کے دروازے کے پاس اپنے سرہانے کلہاڑی رکھ کر گڈریا سوتا تھا۔ سب کی نیند گہری ہوتی تھی لیکن گڈریا اور کتا پھر بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔

علی الصبح بھیڑیں جاگ کر چھٹ پٹاتیں، پیشاب کرتیں، مینگنیاں گراتیں۔ منھ اندھیرے ہی چرواہا جاگ اٹھتا۔ باڑے میں بھیڑوں کا شور ہوتا رہتا۔ انھیں کھولتے ہی احاطے میں میمنے پھراؤں کی کوکھ میں سر دھنسانے لگ جاتے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا لیتی ہوئی بھیڑیں آرام سے کھڑی رہ کر اپنے بچوں کو دودھ پلاتیں۔ باڑے بھر میں گندگی پڑی رہتی۔ پیشاب کے گڑھے بن جاتے۔ ہاتھ میں جھاڑو لے کر گڈریا سارے باڑے کو صاف کرتا۔ وہ قیمتی کھاد کو ٹوکریوں میں ڈھو کر پہلے سے جمع شدہ ڈھیر پر ڈال دیتا۔ اناج کے ڈھیروں کی طرح جمع کیے ہوئے یہ ڈھیر سال کے آخر میں آس پاس کے کسان خرید کر لے جاتے، اس لیے گڈریا اس کام کو بڑی ہوشمندی سے کرتا تھا۔ جب تک یہ سب کچھ ہو چکتا بچوں کے پیٹ دودھ سے بھر جاتے تھے۔ اچھلتے کودتے، چھوٹی چھوٹی دمیں ہلاتے ہوئے وہ اون کے گولوں کی طرح اِدھر اُدھر پھدکتے پھرتے۔ ان سب کو گھیر گھار کر گڈریا بند کر دیتا اور عورتوں کی بنائی ہوئی گرم گرم روٹی بھیڑ کے دودھ میں ملا کر ناشتہ کرتا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے دو چار روٹیاں اور ترکاری باندھ لیتا اور کمبل اور لاٹھی لے کر بھیڑوں کو اشارہ کرتا۔ جنگل میں جانے کے لیے بے تاب بھیڑیں اٹھتیں، باڑے میں بند بچوں کو اونچی آواز سے الوداع کہتیں۔ ان بچوں کا غل غپاڑہ چلتا رہتا۔ اس وقت بار بار پیچھے کی طرف دیکھتی ہوئی اور چلاتے ہوئے بچوں والی بھیڑیں چل دیتیں۔

صبح کی نرم دھوپ تیز ہونے سے پہلے ہی بھیڑوں کے باڑے خالی ہو جاتے راستے کے کھیتوں کو روندتے ہوئے گڈریے بھیڑوں کو لے جاتے۔ یہ کہیے کہ ان بھیڑوں کے جاتے ہی گاؤں کی حرکت و حرارت ختم ہو جاتی۔ جو کسان تھے وہ اپنے مویشیوں کو لے کر جنگل کی طرف چلے جاتے۔ چھوٹے بچے بکریاں چرانے جاتے۔ عورتیں دودھ پیتے بچوں کو گود میں لے کر یا ٹوکری میں ڈال کر کام کے لیے کھیت پر جاتی تھیں۔ ان کے پیچھے پالتو کتے جاتے۔ دوپہر ہوتی تو چرنے پر اون

کاتنے والی عورتوں کے سوا واڑی میں کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔

(۶)

اِدھر کچھ دنوں سے دس بارہ بچے باقاعدہ پاٹھ شالا میں آتے تھے جو مزدوری پر نہیں جا سکتے تھے یا بکریاں چرانا جن کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے بچے آکر پاٹھ شالا میں بیٹھتے تھے۔ میں انھیں گ، م، ن کے سبق ان حروف پر ہاتھ پھیرنے کی مشق کے لیے دیا کرتا تھا۔

دن نکلتا اور باڑے میں بند بھیڑیں جوں ہی باہر آتیں ننگے دھڑنگے بچے پاٹھ شالا میں منھ دھوئے بغیر آ پہنچتے۔ وہ منھ آنکھیں بھی دھو کر نہ آتے۔ صرف کرتہ پہن کر سر پر لال صافہ لپیٹ کر آتے اور گوبر سے لپی ہوئی زمین پر بیٹھ کر ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ سلیٹ پر پنسلیں کُر کُر کرنے لگتیں، تھوک سے سلیٹ صاف کرنے کا سلسلہ چل پڑتا۔ بار بار کوئی نہ کوئی کانی انگلی دکھا کر باہر جاتا۔ پاٹھ شالا کے نیچے کی دیوار کے پتھروں میں کچھ لڑکے نوک بنانے کے لیے پنسلیں گھستے۔ اس طرح گھسائی کی وجہ سے پیچھے کی دیوار کے کافی پتھر ایسے نظر آتے تھے جیسے بھبھوت رمائے ہوں" پنسلیں جلد ختم ہو جاتی ہیں۔" ماں باپ مجھ سے بچوں کی شکایت لے کر آتے۔" آتے وقت منھ دھو کر آنا چاہیے۔ سلیٹ پوچھنے کے لیے پانی سے پوچھنے والا پوتا لے کر آنا چاہیے۔" یہ سب کچھ میرے کئی بار کہنے کے باوجود بھی بات نہیں بنی۔ منھ دھونے کے لیے اکثر جس لڑکے کو گھر بھیجا جاتا تھا وہ واپس نہیں آتا تھا۔ پانی کا پوتا گھنٹے دو گھنٹے ہی میں سوکھ جاتا اور پھر بچے پہلے کی طرح کا آسان طریقہ ہی استعمال کرتے۔ پاٹھ شالا میں بے حساب چھوٹے چھوٹے مچھر تھے جس کی وجہ سے کسی نہ کسی بچے کی آنکھیں آتی رہتی تھیں۔ اسی کی چھوت سے دوسرے کی بھی آجاتیں۔ دُکھتی آنکھوں والے بچے روتے ناچتے اور ان کی مائیں ان کی آنکھیں ٹھیک کرنے کے لیے دودھ سے بھیگے ہوئے روئی کے پھاہے سوتے وقت بچوں کی آنکھوں پر رکھ دیتیں اور ماولی ماتا کی منتیں مانتیں۔

صبح کو جلد ہی لگنے والی پاٹھ شالا ساڑھے دس یا گیارہ بجے بند ہو جاتی۔ گڈریوں کے بچے چیختے چلاتے اور دوڑتے بھاگتے گھر جاتے۔ پھر تین بجے پاٹھ شالا لگتی تھی اور چھ بجے چھٹی ہو جاتی تھی۔ بچے پژمردہ سے ہو جاتے اور یہ سمجھتے کہ قید کر رکھا ہے۔ پھر بھی پاٹھ شالا کے سامنے 'لون پاٹ' کھیلنے کے لیے بھیڑ اکٹھی ہو جایا کرتی تھی۔ چاندنی راتوں میں یہ کھیل بڑی دیر تک چلتا۔ جنگل سے لوٹے ہوئے جوان چھورے بھی کبھی کبھی اس کھیل میں حصّہ لیتے اور کبھی کبھی مجھے بھی اس کھیل میں شامل

کر لیتے۔ چاولوں کی پیٹھی کی طرح صاف چاندنی میں لون پاٹ کا کھیل خوب جمتا اور ہنومان کے چبوترے پر بیٹھ کر بڑے لوگ کھیل دیکھتے۔ کبھی کبھی شوقین لوگ بیجم کا گولہ بناتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیجم کھنکتے رہتے۔ میدان میں پتھر کے ایک دو چھوٹے بڑے گولے اور نال پڑے تھے۔ چڑھتی جوانی والے لڑکے ان پر طاقت آزماتے۔ ایک ہاتھ سے بھاری بھرکم نال سر تک اوپر اٹھانے کا چیلنج دیا جاتا تھا۔ سر کے صافے ہاتھ میں لپیٹ کر چھوکرے نال کا آدمی بناتے۔ اسے سر سے اوپر اٹھا کر زمین پر پھینک دیتے۔ زمین کانپ اٹھتی۔ گول مٹول پتھر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھاتے اور سینے تک لے جا کر پٹک دیتے۔

گاؤں سے دو تین فرلانگ پر بسی ہوئی بستی میں رہنے والے گڈریے برا کا ایک لڑکا سُتا ادھر پاٹھ شالا میں آنے لگا تھا۔ پہلے ماسٹر نے اسے دو چار لفظ اچھی طرح پڑھائے تھے اس لیے جو چار پانچ لڑکے پڑھ رہے تھے ان میں سُتا بہتر تھا۔ بارہ تیرہ سال کا یہ لڑکا کافی لمبا تڑنگا ہو گیا تھا۔ دوسروں بچوں میں جو سمجھ نہیں تھی وہ اس میں تھی۔ سیکھنے کا شوق تھا۔ پاٹھ شالا کے بند ہونے پر بھی وہ چبوترے پر بیٹھ کر سبق رٹا کرتا تھا۔ کبھی کبھی میرے کمرے میں آکر حساب کے سوال پوچھا کرتا تھا۔ پڑھائی کی طرف اس کی یہ لگن دیکھ کر میں نے ایک بار پوچھا "سُتا! پاٹھ شالا میں کب تک پڑھنے کا ارادہ ہے؟"

سُتا بولا "ساتویں پاس کرنی ہے۔"

"تحصیل جانا پڑے گا"

"جاؤں گا۔"

"باپ پڑھنے کو کہتا ہے؟"

"اس کی کون سُنتا ہے۔"

"پڑھنے لکھنے کے بعد بچوں کا دھیان کھیتی سے ہٹ جاتا ہے، سفید کپڑے پہن کر گھومنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔" اس میں ذرا شک ہی تھا کہ برا جس کی یہ رائے ہے اس بچے کو پڑھنے بھی دے گا کہ نہیں۔ پھر بھی میں سُتا کی طرف زیادہ دھیان دینے لگا۔ اس پاٹھ شالا سے ایک آدھ ہوشیار طالب علم بھی باہر جائے تو میرے لیے کافی تھا۔ اس طرح جانے کے لائق لڑکا سُتا ہی تھا۔ بس اسی لیے وہ میرا چہیتا طالب علم بن گیا۔

ان دس بارہ بچوں کے علاوہ پاٹھ شالا میں روز آکر بیٹھنے والے تین اور شخص تھے۔ آبو قصائی،

آننداراموشی اور راما گڈریا۔ یہ تینوں اکثر دن کے وقت، چاہے تھوڑی دیر کے لیے ہی، مگر پاٹھ شالا میں آتے اور دیوار سے ٹیک لگا کر یوں ہی بیٹھے رہتے۔ نہ کچھ بولتے نہ کچھ کرتے مگر آتے ضرور تھے۔ بچوں کو اور میرے منھ کی طرف دیکھتے ہوئے آرام سے بیٹھے رہتے اس سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی لیکن وہ یوں ہی آکر وقت کیوں ضایع کرتے تھے یہ ایک معما ضرور تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس طرح وقت کاٹنا ہی ان کا اصل مقصد تھا۔

گندے بدن اور گندے کپڑوں پر آبو تو تھا ہی بے کار۔ اُسے کچھ کام نہیں کرنا پڑتا تھا کیوں کہ آدمی پیٹ بھرنے کے لیے کام کرتے ہیں اور آبو کا یہ سوال حل ہو چکا تھا۔ وہ ذات کا قصائی ہے یہ معلوم ہوتے ہی واڑی کے لوگوں نے اُسے خوشی خوشی گاؤں میں رکھ لیا تھا کیوں کہ موقعہ پڑنے پر بھیڑ بکری کاٹنے کے لیے قصائی دور سے بلانا پڑتا تھا اور اس میں بڑا وقت لگ جاتا تھا بغیر کسی خاص کوشش کے آسانی ہو گئی۔ اتنی سی گنجائش ہونے کی وجہ سے آبو نے روٹی کا سوال حل کر لیا تھا۔ دوپہر ہوتے ہی وہ روٹی مانگنے کے لیے دو چار گھروں میں جاتا اور گرم گرم روٹی اور سالن لے آتا۔ جسے وہ کہیں بھی بیٹھ کر کھا لیتا تھا۔ اس نے اپنی ساری پریشانی ہی دور کر رکھی تھی۔ آبو کی ضروریات بھی زیادہ نہیں تھیں اور گاؤں کے لیے دو چار روٹیاں کوئی بوجھ نہیں تھا۔ سونے کی جگہ کے لیے بھی اُسے کوئی پریشانی نہ تھی۔ پڑاؤ تھا، میدان تھا، ادھر میرا کمرا بھی تھا۔ اوڑھنے بچھونے کی ضرورت اسے کبھی محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔ جیسے لاوارث کتے اور جنگل کے جانور سوتے ہیں اسی طرح جس جگہ اس کے جی میں آتا بے فکر ہو کر سو جاتا تھا۔ ٹھنڈے پانی کے لیے بھی اس نے اپنا من مار لیا تھا۔

پینتیس چالیس سال کا آنندا راموشی بھی کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ وہ قد میں ٹھگنا اور ہڈیوں کی ایک پوٹ تھا۔ ڈاڑھی کے بال ہمیشہ بڑھے رہتے تھے۔ وہ ان بالوں پر ایک گاندھی ٹوپی پہنے رہتا تھا۔ بدن پر صرف کوٹ اور نیچے چھوٹی نیکر۔ وہ ہمیشہ اسی لباس میں رہتا تھا۔ واڑی میں رامو شیوں کے جو دو چار گھر تھے یہ ان میں سے ایک تھا۔ ان رامو شیوں کا کبھی کوئی خاص پیشہ نہیں تھا لیکن پھر بھی ان کا کام چل ہی جاتا تھا۔

کھانے کی پریشانی پیدا ہونے پر آنندا کندھے پر ایک کمبل ڈال کر تیسرے پہر واڑی سے باہر چل دیتا۔ آس پاس تین چار میل میں دوسرے گاؤں کے کھیت تھے۔ وہ ان کھیتوں کی منڈیروں پر گھوما کرتا۔ کھیت کا مالک پوچھتا "آنندا کہا جا رہے ہو؟"

وہ جواب دیتا "جا رہا ہوں راما رنگاڑے کے کھیت پر۔"

راما رنگاڑے پوچھتا "کیوں رے بدمعاش، کہاں کی تیاری ہے؟"
تو وہ رام رام کر کے کہتا "کارنڈے ٹکا کے باغ کی طرف جا رہا ہوں۔"
ٹکا کارنڈے پوچھتا "کیوں آنندا، کہاں کی تیاری ہے؟"
تو آنندا سامنے کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہتا "ذرا بھونسلے کے احاطے تک ہو آتا ہوں۔"

اس طرح گھوم گھام کر وہ ٹوہ لگا لیتا کہ پیاز کہاں ہے، بینگن کہاں ہیں، جوار کہاں ہے اور باجرہ کہاں ہے۔ جب رات ہوتی، کھیتی باڑی کرنے والے کسان گاؤں کو لوٹ آتے اور نگرانی کرنے والے سو جاتے تو اُس کھیت کے چار بُھٹّے، یہاں سے مٹھی بھر مرچیں، وہاں سے دو بینگن اس طرح کمبل کی جھولی بھر لیتا اور آدھی رات کو واڑی لوٹ آتا۔ صبح ہونے تک وہ بھٹوں کے دانے نکال چکا ہوتا تھا۔ اس کی بیوی ان کو پیس کر آٹا بنا چکی ہوتی، بینگن پکے ہوئے ہوتے۔ اتنے بڑے احاطے سے چار بھٹّے چلے گئے ہیں مالک کو اس کا دھیان بھی نہیں آتا۔ چڑیاں کھا گئیں یا جانور نوچ گئے، یہ پتا نہیں چلتا تھا۔ آنندا پر کوئی شک نہیں کرتا تھا۔ برسوں سے اس کا یہی کاروبار جاری تھا۔ اس آدمی نے چھوٹی چوری کو زندگی کا دھندا بنا لیا تھا اور اس کے طریقے بھی بنائے تھے۔ پیدائشی ہنرمندی کی وجہ سے اس کا کام بہت اچھی چل رہا تھا۔ کئی بار دس پندرہ روز بعد وہ مالک کے پاس جا کر چھوٹی چھوٹی چوریوں کا اقبال بھی کر لیتا تھا۔ خود ہی جا کر پوچھتا "کہو پٹیل! آپ کی غیر حاضری میں ان دس پندرہ دنوں میں کیا کسی نے آپ کے کھیت کے بینگن توڑ لیے تھے؟"

"ہاں رے آنندا، نہ جانے یہ کس چور کا کام ہے۔ جھولا بھر کے بینگن لے گیا۔"
"اچھا! میں ہی لے گیا تھا۔"
"کم بخت اوپر سے بے شرم پوچھ بھی رہا ہے۔"

چوری مان لو تو اس کا داغ مٹ جاتا ہے "اجی مانگنے سے تو کوئی دو بینگن بھی نہیں دیتا پھر کیا کروں؟ کیڑے مکوڑے، طوطے، اناج کھا جاتے ہیں تو کیا آپ سے پوچھتے ہیں۔ جیسے آپ انھیں بھی کچھ نہیں کہتے، مجھے بھی چھوڑ دیجیے۔ بس سمجھ لیجیے کہ چڑیاں کھا گئیں اور بھول جائیے۔"

آنندا کا یہ مزاج اب سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ کبھی فرصت میں وہ دو ساتھیوں کو لے کر جنگل کی طرف نکل جاتا اور ایک آدھ خرگوش یا گوہ مار کر لے آتا۔ منھ بہت پھیکا ہوتا تو دوسرے گاؤں کی ایک آدھ بھیڑ چرا لاتا۔ اس کا کاٹنا، پکانا، کھانا سب جنگل ہی میں کہیں نپٹا یا جاتا۔ آنندا کے بھائی بند بھی اسی طرح جی رہے تھے۔ آنندا بھی اسی طرح جی رہا تھا۔ کبھی کبھار جنگل میں چلنے والی محنت

مزدوری کو شمار نہ کریں تو ہمیشہ سے اس کا یہی پیشہ تھا۔

راما گڈریا البتہ اچھا خاصا بال بچوں والا آدمی تھا۔ عمر کوئی تیس پینتیس کی ہوگی۔ ہونٹوں پر لمبی مونچھیں اور بھاری جبڑا تھا۔ اس کی وجہ سے خاصا مسٹنڈا نظر آتا تھا۔ اس کے گھر سو بھیڑیں تھیں لیکن ان کی دیکھ بھال باپ بھی کرتا تھا اور بیٹا بھی۔ راما کو کوئی کام نہیں تھا بلکہ یوں کہیے وہ کام کرتا ہی نہیں تھا۔ وہ بھی پاٹھ شالا میں آکر ایسے ہی بیٹھا کرتا تھا۔

وہ مسلسل کئی دن تک اسی طرح بغیر بولے بیٹھا رہتا تھا اور پاٹھ شالا بند ہو جانے پر بدن کے اوپر کا کمبل اٹھا کر گھر کی طرف چل دیتا۔ پہلے پہل میں اس سے وجہ پوچھا کرتا تھا "کیوں کوئی کام ہے؟ کیوں آئے ہو؟" لیکن اس پر وہ اپنی کھردری آواز میں کہتا "کچھ نہیں، بس یوں ہی آگیا۔" اس طرح بہت دن بیٹھے رہنے کے بعد ایک دن اس نے کہا "ماسٹر، میرا ایک کام ہے، تیرے سے۔"

پاٹھ شالا بند ہو چکی تھی۔ آنندا اور آبو چلے گئے تھے۔ میں اور راما صرف دو ہی آدمی پاٹھ شالا میں تھے۔ مجھے اس بات پر بڑا اچنبھا ہوا کہ کبھی نہ بولنے والا یہ آدمی بھی آخر بولا۔

مجھ سے اس کو کیا کام ہو سکتا ہے میں اس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا "کیا کام ہے کہیے تو؟"

راما فوراً نہیں بولا۔ گردن نیچے جھکا کر اس نے کچھ وقت لیا۔ ابھی اس کے من میں 'کہوں یا نہ کہوں' کی کشمکش چل رہی تھی۔ اس کی جھجک کو دور کرنے کے لیے میں نے کہا "کیا ماجرا ہے راما جی؟"

پھر ادھر ادھر دیکھ کر راما بولا "میرے پاس ایک جوڑے والا روپیہ ہے۔" جوڑے والا روپیہ یعنی رانی چھاپ روپیہ۔ اوپر کی تصویر میں ایسا نظر آتا ہے کہ رانی نے بالوں کا جوڑا باندھا ہو اسے سرکار نے بند کر دیا تھا۔

"تو پھر؟"

"کہتے ہیں کہ وہ بند ہو گیا ہے۔ مجھ غریب کا مفت ہی میں نقصان ہو گیا۔"

"ہاں بند تو ہو چکا ہے۔ اب بازار میں وہ چلتا نہیں۔"

"تو تحصیل میں آتا جاتا ہے، کوشش کر۔ اگر تیرے رسوخ سے چل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

چلے گا یا نہیں اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ کبھی موقع نہیں آیا تھا۔ کوشش کر دیکھنے میں ہرج نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کہا "دیکھتا ہوں، ممکن ہے چل جائے۔ مجھے دے دیجیے۔" راما

نے ہاں کی اور اٹھ کر چلا گیا رات کو گھر آ کر اس نے وہ روپیہ مجھے دیا۔ ایسے دیا جیسے کوئی ہیرے جواہر دیتا ہے۔ اتنے وقت اس کی جان دھک دھک کر رہی تھی۔ میں یہ بات سمجھ گیا کہ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ماسٹر روپیہ کھا گیا تو کیا ہوگا۔

(۷)

ہفتے کی صبح کو پاٹھ شالا لگا چکنے کے بعد میں وبھوتی واڑی گیا۔ ڈیڑھ دن گھر پر رہ کر پھر پاٹھ شالا میں آگیا۔ راما کے روپے کی یاد آئی۔ میں اُسے بُھنا لایا تھا لیکن راما دو چار روز پاٹھ شالا میں آیا ہی نہیں۔ پوچھ تاچھ کرنے پر پتہ چلا کہ اس کی ایک بھیڑ کھو گئی ہے۔ اُسے کھوجنے وہ کسی دوسرے گاؤں کو گیا ہوا ہے۔ اس کے بعد وہ پاٹھ شالا میں آیا اور میں نے جیب سے پیسے نکالے اور اُسے دے دیے۔

"آپ کا روپیہ بُھنا لیا گیا۔ یہ رہی ریزگاری۔"

میں پڑھنے میں لگ گیا۔ کھلے پیسے دھوتی کے کونے میں باندھ کر راما کب باہر چلا گیا، مجھے معلوم نہیں ہوا۔

رات کو کھانا کھا کر میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں وہ واپس آیا۔ کبھی نہ آنے والا میرے گھر پر آیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا "کیوں راما جی، بھیڑ مل گئی؟"

"ہاں مل گئی، پڑوس کی بستی ہی میں تھی۔"

"پھر چار دن کیسے لگ گئے؟"

"اپنے بہنوئی کے پاس مٹیکر واڑی گیا تھا۔"

میں آگے پڑھنے لگا۔ کافی دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد آخر راما بولا "ماسٹر، میرے روپے کے کھلے پیسے کیسے لائے؟"

"ایک بنیے سے لایا، پہچان کا تھا۔"

یہ نہیں پوچھتا، مطلب یہ کہ گانٹھ میں باندھ کے لائے تھے کہ انگرکھے کی جیب میں یا پھر کیسے؟"

مجھے اس سوال کا رُخ سمجھ میں نہیں آیا۔

"پاجامے کی جیب میں ڈال کر لایا تھا، کیوں کیا بات ہے؟"

"تو کیا یہ سچی بات ہے؟"

"ہاں، کیوں؟"

"تو اچھی طرح یاد کرو، کیا تیرے بھی کچھ پیسے اس جیب میں تھے؟"

مجھے جواب دینے میں کچھ وقت لگا۔

"تھے، مگر کیوں پوچھتے ہو؟"

"تو جم گیا حساب۔ ہمارے پاس زیادہ پیسے آگئے تھے" اور ایسا کہہ کر اس نے جیب سے بٹوا نکال کر اس میں سے دو آنے نکال کر میرے سامنے رکھ دیے۔

ان دو آنوں کے دیکھتے ہی سارا معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔ جوڑے والی رانی کا روپیہ بند تو ہو چکا تھا مگر اس میں چاندی ہونے کی وجہ سے کچھ بیوپاری اُسے اٹھارہ آنے دے کر لے رہے تھے۔ اس حساب سے راما کے روپے کی قیمت بھی اٹھارہ آنے پڑی۔ پیسے دیتے وقت یہ وضاحت کرنا بھول گیا تھا۔ راما نے گھر جا کر چار چار آنے کی ڈھیریاں بنا کر دیکھا لیکن چار ڈھیریوں کے علاوہ دو آنے زیادہ نکلے۔ راما نے سمجھا کہ ماسٹر نے غلطی سے پیسے زیادہ دے دیے اس لیے وہ یہ بات پوچھنے کے لیے واپس آیا۔

یہ ساری وضاحت کر کے میں نے وہ دو آنے اس کی طرف کھسکا دیے۔ اس پر اُس نے ایک آنہ میری طرف پھینکا اور کہا "تو پھر یہ رہنے دیجیے، یہ تیرے پان تمباکو کے لیے ہے۔"

میں نے وہ آنہ نہیں لیا۔ راما جی نے بہت زور دیا پھر بھی نہیں لیا۔ راما نے پوچھا "تو مطلب یہ ہوا کہ روپیہ چلتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں چلتا ہے۔ چلتا ہی نہیں دو آنے کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔"

"یہ ہمیں کیا معلوم۔ گاؤں میں کئی آدمیوں کے پاس روپے پڑے ہوئے ہیں۔ دس بارہ روپے نکل ہی آئیں گے، بھُنوا لائیے گا۔"

"گاؤں کی بات گاؤں دیکھے گا۔ آپ کے پاس ہوں تو دے دیجیے گا۔ میں لے آؤں گا۔"

اگلے ہفتے چلا تو راما نے مجھے بارہ روپے دیے۔ اٹھارہ آنے کے حساب سے میں انھیں بھی بھُنا لایا اور پیسے اس کو دے دیے۔ پان تمباکو کے لیے چار آنے لینے کے لیے راما نے پھر زور دیا۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔

پھر اس نے مجھے رات کو گھر پر بلایا۔ میں اس کے اندھیرے گھر میں جھک کر داخل ہوا۔ چولھے کے سامنے چلم سلگاتے ہوئے ایک ساٹھ ستر سال کا بوڑھا بیٹھا تھا۔ راما کی گھر والی گھر کا کام کر رہی

تھی۔

بیٹھنے کے لیے کمبل بچھا کر راما نے بکری کا دودھ پینے کے لیے چوڑے برتن میں دیا۔ میں اس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ چولھے کے سامنے والے بڈھے کی طرف دیکھ کر راما نے کہا "یہ میرا باپ ہے۔"

بدن پر کوئی کپڑا اوڑھے بغیر اس بوڑھے نے گھبراہٹ میں ہاتھ باہر نکالے اور کہا "جے رام جی کی۔"

راما بولا "ستر سال ہو گئے۔ آٹھ سال کا تھا جب سے بھیڑوں کی رکھوالی کرتا چلا آرہا ہے۔ اسے اور کچھ معلوم نہیں۔" عمر کے آٹھویں سال سے اب تک بھیڑوں کی رکھوالی کے علاوہ اس آدمی نے اب تک کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اور آج بھی یہ وہی کام کر رہا تھا۔ پوتے کے ساتھ دن بھر بھیڑوں کے پیچھے بھٹکا کرتا تھا۔ چہرے پر جھریوں کا جال بن گیا تھا۔ بال سارے ہی پک چکے تھے۔ پھر بھی یہ بوڑھا ہاتھ میں لکڑی لے کر بھیڑیں چرانے جایا کرتا تھا۔ اس کے سوا اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ بیل گاڑی کیسے جوتی جاتی ہے وہ یہ بات نہیں بتا سکتا تھا لیکن جیسے کتّے کو بھیڑیے کی بو آجاتی ہے ویسے اسے بھی آتی تھی۔ کھاد کے لیے رات کے وقت بھیڑیں کھیتوں میں بٹھائی گئی ہوں تو بوڑھا یکایک ناک پھڑ پھڑا کر کہتا "چھوکرو ہوشیار ہو جاؤ، آس پاس کہیں بھیڑیا ہے۔"

چھوکرے تیار ہو جاتے۔ کتّے اچھل اچھل کر دیکھنے لگتے اور دور ٹیلے پر کھڑا بھیڑیا تو وہ لیتا ہوا نظر آجاتا۔ رکھوالی کے لیے ہوشیاری سے بیٹھتے بیٹھتے اُسے عادت سی ہو گئی تھی کہ پاؤں پھیلا کر سونا وہ بھول ہی چکا تھا۔ جس طرح بیل، گھوڑا بیٹھے بیٹھے سو لیتے ہیں ویسے ہی یہ بوڑھا بھی بیٹھے بیٹھے سو لیتا تھا۔ زمین پر لیٹنے کی اُسے قطعی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کے ریوڑ میں جا کر مل جانے پر بھیڑوں کو گڈریے کس طرح پہچان لیتے ہیں یہ بات ہم لوگوں کو ایک پہیلی سی لگتی تھی لیکن بوڑھا کافی بہت تجربے کار آدمی تھا۔ نئے سرے سے بھیڑیں پالنا شروع کرنا ہو تو اس کے لیے صرف مالک کو خرید سے ہی شروعات نہیں کرنی پڑتی بلکہ ایسا آدمی آدھا ناریل اور اس پر پرشاد کی ہلدی چھڑک کر کسی اچھے گڈریے کے پاس جاتا اور وہ ناریل دے کر اس سے کہتا "میں کام شروع کر رہا ہوں۔"

پھر وہ گڈریا اپنے ریوڑ سے منتخب بھیڑ نکال کر مانگنے والے کو مفت دے دیتا تھا۔ ایسی دس پندرہ بھیڑیں جمع کر کے شروعات کی جاتی ہے اور دو تین سال میں خود بھیڑیں مانگنے والا دوسروں کو بھیڑیں دے سکتا ہے لیکن کام شروع کرنے کے نام پر لی ہوئی بھیڑیں نہ بیچی اور نہ کاٹی جا سکتی ہیں۔

اس قاعدے کی پوری پابندی کی جاتی ہے۔

کسی اور گاؤں کا ایک آدمی کاکوا سے ایک بار دو چار بھیڑیں لے گیا۔ دو ایک سال بعد بوڑھا اس گاؤں میں گیا تو اس آدمی نے لکنت آمیز لہجے میں کہا۔ "کاکو، تیری چاروں بھیڑیں مرگئیں۔"

"مرگئیں؟ ان کے کوئی بچے؟"

"ہا، بچے وچے کچھ نہیں، ختم ہی ہوگئیں۔"

بوڑھے کو یہ بات سچی نظر نہ آئی اس نے کہا "ذرا اپنا باڑا دکھاؤ"

اس آدمی نے باڑا دکھایا۔ کافی دیر تک بوڑھا بھیڑوں کو دیکھتے ہوئے گھومتا رہا اور کچھ دیر کے بعد اس نے اپنی بھیڑوں کی اولاد پہچان لی اور کہنے لگا "یہ دو بچے میری بھیڑ کے ہیں۔"

اور یہ بات بالکل درست تھی۔ جھینپے ہوئے اس آدمی نے بھی اس کا اعتراف کرلیا۔ راما گڈریے نے اپنے باپ سے متعلق یہ واقفیت بہم پہنچائی تو مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے کاکوا سے پوچھا "کاکوا! بھیڑوں کے بچوں کو آپ نے کیسے پہچانا؟"

بوڑھا بولا "بچے، اس کی ترکیب ہوتی ہے۔ چہرہ، رنگ، روپ سمجھ میں آئے بنا کیسے رہے گا۔ اب تو ہے۔ تیرے باپ، تیری ماں، تیرے نانا کا کچھ نہ کچھ نقش تجھ میں ضرور ہوگا۔ ناک کہو، آنکھ کہو، کچھ نہ کچھ مطابقت ہوگی ہی۔"

پھر راما مجھے اندر لے گیا۔ دیے کی روشنی میں وہ اور اندر گیا اور ایک چھوٹی ہنڈیا لے کر باہر آیا۔ اس میں چاندی کے روپے تھے، سب جوڑا چھاپ کے۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس گڈریے کے پاس اتنا روپیہ ہوگا، میں خواب میں بھی اس کی توقع نہیں کرسکتا تھا۔

راما بولا "بڑے دنوں سے بچاتا چلا آرہا ہوں۔ گن لے اور ساتھ لے جاکر بھنالا۔"

میں نے گنے، تین سو چالیس ہوئے۔ تعداد بتاتے ہی راما نے مان لیا اور بے فکری سے پیسے میرے حوالے کردیے۔ ماسٹر نے پانچ روپے کم گنے ہوں گے یا اتنے پیسے کھا جائے گا اُسے اس کا شک نہیں ہوا۔

میں نے کہا "راما جی، مجھے اتنے روپے تبدیل کرانے اور آپ کو نئے روپے دینے میں ممکن ہے کچھ دن لگ جائیں، آپ کو جلدی تو نہیں ہے۔"

راما نے کہا "آرام سے ادلا بدلی کرواؤ۔ دس پندرہ دن بھی لگ جائیں تو کوئی حرج نہیں۔"

میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔

(۸)

مئی کا مہینہ ختم ہوا اور جون آگیا۔ گرمی ختم ہو کر برسات آگئی۔ برساتی کیڑے نظر آنے لگے اور گہن شروع ہو گیا۔ آسمان گہرا ہو گیا، صاف اور کھلی دھوپ غائب ہو گئی۔ ہوا چلنے لگی۔ پیڑ پودے ڈولنے لگے۔ چاروں طرف گرد و غبار اڑنے لگا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر لوگ کہنے لگے "یہ ہوا پانی کو اڑا دے گی۔" لیکن ایسا نہیں ہوا۔ موسلا دھار مینہ برسا۔ بنگرواڑی میں دھواں دھار پانی برستا ہے۔ لاوارث کتے دیوار کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ بادلوں کے جلد کھلنے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ گڈریوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سر پر ٹاٹ رکھ کر بھیگتی بھیڑوں کو نکال کر جھونپڑی میں لے آئے۔ گھروں میں ٹھسا ٹھس بھری ہوئی بھیڑوں نے کھڑے کھڑے بدن جھٹکے۔ گڈریوں کے گھر گیلی اون کی بدبو سے بھر گئے۔ بوچھار پر بوچھاریں آئیں۔ گرم زمین سے بھاپ نکلی۔ دھول اڑی، کیچڑ ہو گیا اور وہ بھی بہہ گیا۔ پتھر صاف ہو گئے، گھاس پھوس کے چھپروں والے گھر ٹپکنے لگے۔ اچھی خاصی لپی ہوئی زمین گیلی ہو کر اکھڑنے لگی۔ تب گڈریائنیں بھنبھنائیں اور ٹپکنے والی جگہوں پر انھوں نے چھوٹے چھوٹے برتن رکھ دیے۔ بھیڑوں کی چھٹ پٹاہٹ کے ساتھ ہی بھرے ہوئے برتنوں میں ٹپکتے ہوئے پانی کی آواز سے کان اکتا گئے۔ مٹی کی چھتوں والے گھروں میں بھی پانی ٹپکنے لگا۔ سر پر ٹاٹ لے کر گڈریے چھت پر جا چڑھے۔ جہاں پانی اکٹھا ہو گیا تھا وہیں سے چھت میں سوراخ کر کے اندر رِس رہا تھا۔ ان سوراخوں کو انھوں نے مٹی پتھر ڈال کر عارضی طور پر بند کر دیا۔

ہوا میں ٹھنڈک آگئی۔ گڈریوں کی کلہاڑیاں لکڑیاں کاٹنے لگیں اور گڈریائنوں کا جمع کردہ نمک ختم ہونے لگا۔ طوطے کے رنگ کی گھاس نے زمین سے سر اٹھا لیا۔ آنگن میں، چھت پر، چھپر پر جہاں نہیں اگنی چاہیے وہاں گھاس اگنے لگی اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آنے لگا۔

اتنے چھوٹے چھوٹے مینڈک نظر آنے لگے کہ انگوٹھے کے ناخن پر بیٹھ جائیں۔ راہ چلتے ہوئے ٹنا ٹن اچھلنے لگے۔ کوے ان پر جھپٹنے لگے۔ چھوٹے چھوٹے پروں والے ہزاروں بلکہ لاکھوں کیڑے اڑنے لگے اور مینا اور گوریوں نے ان کا صفایا کر ڈالا۔ جو اِن سے بچے وہ چراغوں کے جلتے ہی پروانوں کی طرح ان کی لو سے جل گئے۔ دو دن بعد ان کے پتلے پتلے پر یہاں وہاں جھڑے ہوئے ملے۔ پرکھو کر چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی طرح نظر آنے والے وہ پیلے رنگ کے کیڑے غائب ہو گئے۔ اینٹ کے رنگ کے لمبے تیلن کیڑے ایک دوسرے کی پیٹھ پر چڑھ کر ان گنت پیروں سے چلنے لگے۔ انگلی کے برابر کے کالے

کیڑے اِدھر اُدھر الگ پھرنے لگے جو آدمی یا کسی جاندار سے چھُوکر لپٹ کر گول ہو جاتے اور پڑے رہتے۔ گڈریوں کے بچے جان بوجھ کر ہاتھ لگا کر ان گول کیڑوں کو ہتھیلی پر لے کر کھیلنے لگے۔ مکھیاں بے حد ہو گئیں اور جھونپڑیوں میں بھنبھنانے لگیں۔ بھیڑوں کی ناک بیٹھنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے مچھر بہت ہو گئے اور گڈریوں کی آنکھوں کے سامنے اڑنے لگے۔

ہل سے جوتی ہوئی زمین میں ڈھیلے گھُل گئے۔ زمین نے پانی پی لیا۔ جہاں تہاں چھوٹے بڑے گڑھے پانی سے بھر گئے اور ان میں نیلے آکاش کی پرچھائیں نظر آنے لگی۔ کھیت میں گزرتے ہوئے آدمیوں، جانوروں اور بھیڑوں کے پیروں سے کیچڑ چپکنے لگا۔ سطح مرتفع کا میدان بھیگ گیا اور اس کے سبزہ زار پر گہری، کالی بھیڑیں گھومنے لگیں اور ان کی پیٹھ پر کالی کوتوال چڑیاں بیٹھ کر پھٹی پھٹی سی آوازیں نکالنے لگیں اور نظروں سے چھپ کر تیتر اونچی آواز میں چلانے لگے۔

(۹)

کسی مقررہ وقت پر پاٹھ شالا کو کھولنا اور بند کرنا بنگر واڑی کی پاٹھ شالا کے لیے کبھی ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ ساری دنیا میں گرمی کی چھٹیاں ہوتی ہیں لیکن یہاں فصل کاٹنے کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ جب جی چاہتا ہے لڑکے پاٹھ شالا میں آتے ہیں اور جب دل نہیں چاہتا تو نہیں آتے ہیں۔ جس طرح بسیں پوری بھر جانے پر چلتی ہیں اسی طرح جب پاٹھ شالا میں سارے طالب علم حاضر ہو جاتے ہیں جبھی پڑھائی شروع ہو سکتی ہے اور ماسٹر کا دائرۂ عمل پاٹھ شالا تک ہی محدود نہیں رہ سکتا تھا۔ کوئی چٹھی لکھ دینے کو کہتا تو کوئی عرضی لکھواتا۔ جب میں اتوار کو چھٹی منانے کے لیے گھر جانے کی خاطر نکلتا تو ڈاک میں ڈالنے کے لیے گاؤں والے مجھے اتنے خط دے دیتے تھے کہ میرے کوٹ کی جیبیں بھر جاتیں۔ یہ سارے کام جب میں کسی عذر کے بغیر کرنے لگا تو جس کا جی چاہتا اپنے کام کے لیے کسی بھی وقت آ جاتا۔ عورت مرد کے جھگڑوں سے لے کر بھیڑوں کی چوری تک کی شکایتیں ماسٹر کے پاس آتیں۔ ماسٹر پڑھا لکھا اور سیانا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ قاعدے قانون بھی جانتا ہوگا اور برا بھلا سمجھنے کی عقل بھی اسے ہونی ہی چاہیے۔

پاٹھ شالا نہ سہی مگر اس طرح کے کام کرنے میں وقت کٹنے لگا۔ محکمے کی طرف سے لڑکے کم ہونے کی شکایت آتی تو کہہ دیا جاتا کہ پاٹھ شالا نئی ہے اور کٹائی جاری ہے۔ اس طرح میں گاؤں کی پاٹھ شالا کو سنبھالنے لگا۔ پاٹھ شالا گویا عدالت، پڑاؤ، پولیس، تھانہ، میونسپل کمیٹی سب کچھ ہی تھی اور ماسٹر

گویا جج، تھانیدار، پٹیل، پٹواری اور ٹکٹ بیچنے والے بھی تھا۔ لیکن واڑی کا کوئی جھگڑا عام طور پر واڑی سے باہر نہیں جاتا تھا۔ ماسٹر اور مکھیا، کاکوا، شیکوا، جیسے بزرگ لوگ انصاف دیتے تھے۔ مجرم دس آدمیوں کی بات کو ٹالتا نہیں تھا۔ انصاف کی رو سے جو سزا دی جائے وہ اُسے مان لیتا تھا۔ اگر اسے منظور نہ ہو تو اس کے لیے اپیل کرنے کی گنجایش ہوتی تھی۔ یہ اپیل گڈریوں کے مانے ہوئے مہا دیوتا کے سامنے کی جاتی۔ گڈریوں کی ایک بڑی جماعت اکٹھی ہو جاتی تھی اور پھر انصاف ہوتا تھا۔ ایسا قدم کوئی اٹھاتا نہیں تھا کیوں کہ مہا دیوتا کو متوجہ کرنے کے بعد اُسے کھانا کھلانا پڑتا تھا اور اتنی بڑی دعوت پر کافی خرچ آتا تھا۔

ایک ساتھ ہی بیاہ شادی رچانے کا رواج بھی واڑی میں تھا۔ ہر سال نہورت دیکھتے اور اس رن گاؤں بھر کی ساری شادیاں نپٹا دی جاتیں۔ اس طرح سارے گاؤں کو کھلانے کا بوجھ ایک شخص پر نہیں پڑتا تھا۔ دس بارہ شادیاں ہوتیں تو ہر ایک کے حصے میں دس پندرہ آدمیوں کا کھانا ہوتا۔ شادیوں کے اس موقعے پر اگر کسی غرض مند کو پیسے کی کمی ہوتی تو سارا گاؤں اکٹھا ہو جاتا اور "فلاں شخص اٹک گیا ہے اُسے پار لگاؤ" کی بات پختہ ہو جاتی۔ اس کا بوجھ سب مل کر اٹھاتے اور اس غرض مند کا کام بن جاتا۔

دادو کی دھمکی کی پروا نہ کر کے میں گاؤں میں بے دھڑک گھل مل گیا تھا اور اب کچھ ایسا عالم ہو گیا تھا کہ ماسٹر کے بغیر گاؤں کا پتہ بھی ہل نہیں سکتا تھا۔

واڑی میں کسان بہت کم تھے۔ برسات کی بارش کی وجہ سے زمین سے گھاس پھوٹ پڑی تھی اور خوب گھنی تھی۔ بوائی سے پہلے ایک بار سراون چلا کر کسانوں نے بیکار گھاس کو زمین میں ملا دیا۔ اس کے بعد ساون کی بارش ہوئی۔ کھیتوں میں خوب کیچڑ ہوا۔ لوگ آسمان کھلنے کی راہ دیکھنے لگے۔ بادل کھلے، کیچڑ سوکھ گیا۔ زمین اتنی سوکھ گئی کہ بیلوں کے پیر نہ دھنسیں اور ہل کے چھید بھی بند نہ ہوں۔ نمی نیچے رہ گئی اور اوپر سے زمین سوکھ گئی۔ اس کے بعد بوائی کی ہل چل شروع ہوئی۔ باجرے اور دالوں کی بوائی شروع ہوئی۔ بیج کی پوٹلی لے کر ہل بیل کے ساتھ لوگ علی الصبح کھیتوں کی طرف جانے لگے۔

بوائی کی اس دوڑ میں شیکو میرے پاس آیا۔ وہ گاؤں میں زیادہ نظر نہیں آتا تھا۔ اپنے دو تین ایکڑ کے ٹکڑے میں لگا رہنا ہی اس کا کام تھا۔ صبح کے وقت بدن پر دھوتی اوڑھ کر وہ میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ دھوتی اس نے اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ

اس کا سوکھا ہوا چہرہ اور رگڑ کھاتے ہوئے سخت بنے ہوئے بڑے ناخنوں والے پیر ہی بس دکھائی دے رہے تھے۔ میں بیٹھا تھا اور آبو بھی موجود تھا۔

شیکو کھڑے کھڑے ہی بولا "ماسٹر! مجھے ایک بیل تو ڈھونڈ دے، بوائی رُکی ہوئی ہے۔"

میں پاٹھ شالا کا ماسٹر تھا، میرے پاس بیل کہاں سے آتا۔ مگر شیکو کو یہ بات بتانے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔

وہ بولا۔ "تو مانگ لے تو مل جائے گا۔ میرے پاس تو ایک ہی ہے، ایک مرگیا۔ دوسرا ملے تو بوؤں ورنہ سال بھر بھوکوں مرنے کی نوبت ہے۔"

میں نے کہا "لیکن کسی کے پاس ہے تو بتاؤ تاکہ میں اس سے مانگ سکوں۔"

"جن کے پاس ہے ان کی بھی تو بوائی چل رہی ہے۔ خود کو لٹکا کر کون دے گا۔ میں سب سے مانگ چکا۔"

"پھر میں کس سے مانگوں؟"

"تو جیسے چاہے کر لیکن میری ضرورت پوری کر دے۔ سارا گاؤں کہتا ہے کہ وقت پڑنے پر ماسٹر ہی کام آتا ہے۔"

اب تک آبو چپ تھا۔ شیکو کی طرف منہ کر کے وہ بولا "تو پاگل تو نہیں ہے؛ ماسٹر کے پاس بیل کہاں سے آیا؟ وہ کوئی کسان ہے! یوں ہی بے مطلب مانگنے چلے آئے ہو۔ جاؤ گھر اپنے۔"

آبو کے پھٹکارتے ہی شیکو نیچے اتر آیا۔ اُسے شک ہوا کہ کہیں اس نے غلطی تو نہیں کر دی "گھر تو جانا ہی ہے لیکن ماسٹر جی، دیکھیے اگر کہیں بات بن جائے۔" یہ بات اس نے بڑی لجاجت سے کہی۔

آبو دل میں طے کر کے اٹھا۔ اس نے شیکو کا بازو پکڑ کر اُسے نیچے اتار دیا اور کہا "بڑا عقلمند ہے شیکو۔ ماسٹر نے کیا بیل گانٹھ میں باندھ رکھا ہے۔" اس پر گڑ گڑ اکر بڑ بڑاتا ہوا شیکو چلا گیا۔ آبو نے واپس آکر کہا "ماسٹر جی اس کا خیال نہ کیجیے گا وہ یوں ہی پاگل ہے۔"

مجھے رہ رہ کر محسوس ہوتا رہا کہ میں تو صرف گ... م... الف... لون ہی لکھنا سکھا رہا ہوں مگر ان کی ضرورت الگ ہی ہے۔ آبو کو گرہستی چاہیے، آنندا کو روٹی اور شیکو کو بیل۔ دو دن تک شیکو ہر جگہ ہو آیا مگر اسے بیل نہیں ملا۔ وہ گھر جا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ گھر والی سے کہنے لگا "میرا تو کوئی بس نہیں چلتا۔"

شیکو کی عورت گاؤں کی ساری گڈریائنوں سے آدھ ہاتھ اونچی تھی۔ اس کے جسم میں طاقت بھی زیادہ تھی۔ کھیتی کا سارا کام مرد کے برابر کرتی تھی۔

شوہر جب ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا تو اس نے کہا "کن کن سے مانگا؟"

"سارا گاؤں گھوم آیا۔ کوئی نہیں دیتا۔"

"پھر؟"

"اس سال بھوکوں مریں گے!"

شوہر کی بات اس عورت نے سنی۔ اس نے شوہر کی آنکھیں دیکھیں تو اُسے محسوس ہوا کہ یہ ایسے دیے ہیں جن کا تیل ختم ہو چکا ہے۔ اس پر بھی وہ ہمت سے بولی "کل بوائی کرنی ہے۔"

"اور بیل کہاں سے لائے گی، اری"

"میں لے آؤں گی۔"

"کہاں سے لائے گی؟"

"جہاں سے چاہوں لے آؤں۔"

"پھر بھی؟"

"تمھیں اس سے کیا مطلب؟ میں بیل لے آؤں گی، صبح اٹھ کر کھیت پر چلے جانا۔"

بیوی کس کا بیل لے کر جائے گی؟ یہ سوچتے ہوئے صبح شیکو اٹھا اور کندھے پر ہل لاد کر ایک ہاتھ سے ایک بیل لیے ہوئے کھیت کو چلا گیا اور گاؤں کی طرف منھ کر کے منڈیر پر جا بیٹھا اور بیوی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

گھنٹہ بھر بیت گیا۔ جب کہیں شیکو کی گھر والی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے پاس بیل نہیں تھا۔ شیکو کا منھ اتر گیا۔ بیوی نے شرط بدی تھی لیکن اُسے بیل نہیں ملا۔ اب بوائی نہیں ہوگی۔ سب کی بوائی ہو جانے کے بعد بیل ملے گا لیکن اس سے کیا فائدہ؟ بوئیں بھی تو فصل خراب ہوگی، اُگے گی نہیں۔ سال بھر کا اناج اگر نکل نہ پایا تو بھوکوں مرنا پڑے گا۔ گاؤں کو چھوڑ کر روزی کے لیے گاؤں گاؤں کی خاک چھاننی ہوگی۔

یہ سوچ کر اس محنتی گڈریے کا منھ اُتر گیا اور اس کی ہٹّی کٹّی گھر والی کھیت میں آ پہنچی۔

"کیوں ری! نہیں ملا بیل؟"

"ملے گا کیوں نہیں، ہل جوتو۔"

"لیکن بیل کہاں ہے ؟"

"میں تو ہوں ۔ ایک طرف بیل جوتو دوسری طرف سے میں کھینچوں گی ۔"

گھر والی کی اس بات سے شیکو تھرا اٹھا ۔ کیا کہے، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا ۔

"ہشت، ایسا کیسے ہوگا ۔"

لیکن وہ عورت تو پختہ ارادہ بنا کر ہی آئی تھی ۔ اپنے جسم پر اُسے یقین تھا ۔

"ایسا ویسا کچھ نہیں، جوتو ہل ۔"

شوہر جگہ سے ہل نہیں رہا تھا ۔ گردن نیچے کیے بیٹھا تھا ۔ یہ دیکھتے ہی وہ اُٹھی، اس نے بیل جوت لیا، جوئے کا دوسرا حصہ کندھے پر دھر لیا اور چلا کر بولی "آؤ! کھینچو!"

کلیجے پر پتھر رکھ کر کمزور جسم کا شوہر اٹھا اور اس نے موٹھ کو پکڑ کر اشارہ کیا ۔ اور بیل ہلا بیوی ہلی ۔ ہل کا پھل گیلی مٹی میں دھنس گیا اور زمین کو چیرتے ہوئے بڑھ چلا ۔ شیکو نے باجرے سے بھری ہوئی مٹھی کھولی ۔ کھوکھلے بانس کی نلی میں سے دانے نیچے زمین پر گرے ۔

جسم کی طاقت سے شیکو کی بیوی بیل کے ساتھ ہل کو کھینچتی رہی ۔

شیکو صبح سے دوپہر تک بوتا رہا ۔ پھر اس نے اور ہانپتی ہوئی بیوی نے بیٹھ کر روٹی کھائی شیکو سے کچھ بولا نہیں گیا، گھر والی کچھ بولی ۔ پھر دونوں نے سراون چلا کر بیج کو مٹی کے نیچے دبا دیا ۔ شام تک ان تینوں نے دو ایکڑ زمین کا کھیت بو ڈالا تھا ۔ سورج چھپ گیا تو یہ تینوں تھکے ماندے گھر واپس لوٹے ۔

یہ بات گاؤں میں پہنچی تو سب نے حیرت کا اظہار کیا ۔ اس میں تعریف حیرانی اور کہیں کہیں مذاق کا بھی پہلو تھا ۔

رات کو پاٹھ شالا سے گھر جاتے ہوئے میں ایک منٹ کے لیے شیکو کے گھر کے سامنے کھڑا رہا ۔ اندر لیمپ کی روشنی میں شیکو کی بیوی دیوار سے لگ کر اوندھی لیٹی ہوئی تھی اور اس کی پیٹھ پر کھڑا ہو کر شیکو اس کے جسم کو دبا رہا تھا ۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لے رکھا تھا اور وہ آہستہ آہستہ ایک پیر اٹھا کر بیوی کی دکھتی پیٹھ کو آرام پہنچا رہا تھا ۔

(۱۰)

سنیچر وار کو پاٹھ شالا کی چھٹی کے بعد میں اپنے گاؤں گیا اور چھ کوس کا فاصلہ طے کر کے جب

لوٹا تو بے حد تھک گیا تھا۔ آنے جانے کا یہ کام بے شک بہت تھکا دینے والا تھا۔ جسمانی مشقت کی بات چھوڑ بھی دیں تو بھی اتنی دیر سے یہ سفر کرتے کرتے مجھے بہت پریشانی کا سامنا تھا۔ پاٹھ شالا کی چھٹی کے بعد نکلتا۔ یوں کہیے کہ دس گیارہ بجے کے بعد۔ سفر شروع کرتے کرتے دوپہر ہو جاتی تھی وہاں پہنچتے ہی ماں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھا کر میں لیٹتا تو شام ہو جاتی۔ رات کو گہری نیند سوتا۔ اتوار کو صبح کھانا آرام سے کھاتا لیکن دن کے ڈھلتے ہی واپس لوٹنے کا خیال ستانے لگتا۔ رات کو سوتے وقت میں بار بار ماں کو یاد دلاتا " ماں میں بڑے سویرے ہی چلا جاؤں گا، پراٹھے بنا دینا" ماں بیچاری نیند کی ایک ہی جھپکی کے بعد اٹھ کر پراٹھے پکانے بیٹھ جاتی۔ صبح کا تارا نکلنے کے وقت ہی میں پراٹھوں کی جھولی کندھے پر رکھ کر بنگر واڑی کی طرف چل چکا ہوتا۔ ہر سنیچر کو جانا کوئی آرام دہ بات تو تھی نہیں لیکن دل یہی چاہتا تھا کہ ضرور جاؤں۔ گھر کی کشش ایک الگ ہی چیز ہوتی ہے۔ میرے اس طرح سختی سہنے پر آبو کو رحم آتا تھا۔ وہ کہتا " ماسٹر جی اپنا گھر کب بسا رہے ہو؟"

"کیوں رے؟"

"کھانا پکانے کی مصیبت بڑی مصیبت ہے۔ شادی کرو اور گھر بساؤ۔"

شادی کر کے گھر بسایا جائے تاکہ کھانا پکانے کی مصیبت سے چھٹکارا ہو۔ آبو کو شادی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ہوگی۔ درست ہے۔ اس بیچارے کو جو محسوس ہوا اس نے کہہ ڈالا۔ ہاتھ سے روٹیاں سینک کر کھانے سے کوئی شخص اوب بھی جاتا ہوگا لیکن صرف اس لیے سب چھوڑ کر شادی کر لوں یہ خیال تک میرے دل میں نہیں آیا۔ زیادہ اوب جاتا تو ایک آدھ ہفتہ گھر جانا بھی موقوف کر دیتا اور اگر جاتا تو سوموار کے عوض منگل کو واپس آتا۔ سفر کی سختی سہنا اسی طرح جاری رہا۔

اس دفعہ دیر سے چلا تھا۔ گاؤں پہنچا تو شام ہو گئی تھی۔ بھیڑیں ابھی کھیتوں سے نہیں لوٹی تھیں۔ اس بار میں راما کے روپے بھی تبدیل کرا لایا تھا۔ پراٹھوں کی جھولی میں رکھے ہوئے دھن کا بوجھ بھی ساری رات میرے سر پر رہا۔ اس جھولی کو کس کر پکڑے ہوئے، یہ سوچ کر کہ کوئی اچانک آکر مجھے لوٹ نہ لے میں آگے پیچھے دیکھتا ہوا بہت تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا کیوں کہ ایسا حادثہ ہوتا تو بڑی خوفناک بات تھی۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی دل سے یہ خوف جاتا رہا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے دیا جلایا اور ہاتھ پیر دھو کر ذرا آرام سے بیٹھ گیا۔ سفر کر کے پاؤں پھیلا کر بیٹھنا بڑی آرام دہ بات ہوتی ہے اور اسے وہی جان سکتا ہے جس کو اس کا تجربہ ہو۔

برساتی ہوا کی وجہ سے دیوار میں سیلن آگئی تھی۔ دو چار دن تک کھلی ہوا اندر نہ جانے کی وجہ

سے کمرہ گھٹا گھٹا سا ہو گیا تھا۔ کونے میں بیٹھے ہوئے مچھر اڑنے لگے تھے۔ ان کی وہ گنگناہٹ جس سے میں تنگ آچکا تھا، جاری تھی۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اور اوب گیا تھا۔ آنکھیں بند ہونے لگی تھیں لیکن چراغ جلتے وقت سونا ٹھیک نہیں۔ لکشمی کے آتے وقت سونا گویا افلاس کا نشان ہے۔ لیکن جسم تو آخر جسم ہے۔ قسمت والے کا ہو یا بد قسمت کا۔ تھکنے پر آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہی ہے۔ جسم آرام کرے گا تو آنکھیں بند ہونے ہی لگیں گی اور پھر نیند بھی آئے گی۔ مگر یہ بات ٹھیک نہیں ہے اور یہ اچھا نہیں ہے!

بیٹھا تھا لیکن آہستہ آہستہ پورے طور پر لیٹ گیا۔ دُکھتا ہوا بدن ڈھیلا چھوڑ کر پڑا رہا اور آنکھیں بھی بند کر لیں۔ زور سے آنکھیں بند کر لینے پر آنکھوں کے سامنے چمکتے ہوئے رنگوں کی گویاں کیوں دکھائی دیتی ہیں؟ جامنی، نیلا، کالا رنگ کیوں نظر آتا ہے اور کس لیے نظر آتا ہے؟ اگر پاٹھ شالا میں کچھ بچّے بیٹھے ہوں تو ماسٹر کا مذاق بھی اڑنے لگے۔ شاید اس کا جواب آسان ہو گا لیکن مجھے معلوم نہیں۔ مڈل پاس کر کے ماسٹر بن جانے والے چھوکرے کو کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن بچے پوچھ بیٹھیں تو مشکل ضرور پڑے گی۔ اب یہ بات الگ ہے کہ بنگرواڑی کے بچے ہوشیار نہیں ہیں مگر معلم ہونے کی حیثیت سے مجھ کو یہ بات جاننی چاہیے اور اس کی وجہ معلوم کرنی چاہیے۔ آنکھوں کی بناوٹ کیسی ہوتی ہے اب یہ سب کچھ علم الانسانی کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

پڑھا ہوا سب کچھ جلدی بھول جاتا ہے۔ آنکھیں بھاری ہو کر بند ہو گئیں۔ وہ کھل ہی نہیں رہی تھیں۔ کوئی چار گھنٹے کے بعد جب میں جاگا تو رم جھم پھوار پڑ رہی تھی۔ کمرے میں دیا نہیں تھا۔ اور کھلے دروازے سے تیر کی طرح لگنے والی ٹھنڈی ہوا اندر آرہی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا اور یکایک حافظے پر ایک تیر سا لگا۔ میں لپک کر اُٹھا اور سرہانے کی طرف ٹٹول کر دیکھا۔ جھولے پر ہاتھ رکھا۔ اس میں پیسوں کی پوٹلی نہیں تھی۔ میرا کلیجہ کانپ اٹھا۔ اندھیرے میں مَیں نے بار بار جھولی کی تلاشی لی۔ دھوتی، کرتہ، سب کو باہر کھینچا مگر روپیہ ہاتھ نہیں آیا۔ جیب سے دیا سلائی نکال کر مٹی کے تیل کا لیپ جلایا۔ کسی پاگل آدمی کی طرح میں جھولے، بستر اور زمین پر ہر چیز کو ٹٹولتا رہا۔

پیسوں کو گئے چار پانچ دن ہو گئے تھے۔ میں روز کا کام کاج کرتا رہا۔ کھانا کھاتا تھا، پاٹھ شالا جاتا تھا، رات کی سبھا میں بھی بیٹھتا تھا لیکن اس کا اندازہ نہ کر پایا کہ وہ پیسے گئے کیسے؟ جوں جوں سوچتا تھا الجھن اور بڑھتی گئی۔ گھر سے نکلتے وقت کیا میں نے ساتھ لیے بھی تھے؟ راستے میں ستانے کے لیے جب میں بیٹھا تھا، جھولی سے پوٹلی کہیں گر تو نہیں پڑی تھی۔ حفاظت کے خیال سے میں نے یہ پوٹلی

اور پراٹھوں کی پوٹلی ایک ساتھ باندھ لی تھی۔ مجھے اکیلا مسافر دیکھ کر اگر کوئی ٹھگ حملہ کردیں تو میرے پاس روٹی کی پوٹلی کے سوا کچھ بھی نہ پائیں، میں نے کچھ ایسا اہتمام کیا تھا۔

اب تو پراٹھے بھی چلے گئے تھے اور روپے بھی۔ پراٹھوں کی خوشبو کی وجہ سے کیا کوئی کتا گٹھری لے گیا یا بدھو نظر آنے والے آبو نے ہی ہاتھ صاف کر دیا۔ اس کی نظر سے تو ایسا لگتا نہیں تھا۔ اس کے برتاؤ سے کسی طرح کا شک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پھر گھر میں گھس کر پیسے کون لے گیا۔ چوبیس گھنٹے یہی خیال لگاتار میرے من میں چکر کاٹتا رہا۔ راما نے مجھ پر اعتبار کر کے تبدیل کرانے کے لیے وہ روپے مجھ کو دیے تھے اور میں بے وقوفی سے انھیں کھو چکا تھا۔ میں انھیں کھا نہیں گیا تھا۔ اس طرح کا خیال بھی میرے من میں نہیں آیا تھا لیکن کیا راما اس پر یقین کرے گا۔ وہ اس کے لیے کیسے تیار ہوگا۔ اگر میں کل جا کر اس سے کہوں کہ ارے بابا، تمھارے پیسے میری جھولی سے غائب ہو گئے تو وہ یہی کہے گا "دس بارہ روپے بدلوا کر اس کائیاں آدمی نے شرافت کا ڈھونگ رچا اور زیادہ رقم ہاتھ آتے ہی ہڑپ کر گیا اور آخر اپنی اوقات پر اتر آیا۔ ہمارے گنوارپن سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنی جیب بھر لی ہے۔" قدرتی طور پر راما گڈریا یوں ہی کہے گا۔ جس شرافت کو قایم کرنے کے لیے میں کوشاں تھا وہ ایک پل میں مٹ جائے گی۔ دل میں یہ خیال آتے ہی میں بے تاب ہو جاتا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ میں نے کیوں اتنی بڑی رقم کو بدلوانے کا ذمہ لیا۔ ممکن ہوتا تو میں اپنی گانٹھ کے روپے راما کو دے دیتا اور اس کے کانوں تک یہ بات پہنچنے ہی نہ دیتا کہ روپے گم ہو گئے ہیں۔ اس کا بھی امکان نہیں تھا۔ چاروں طرف کی راہیں بند ہونے کے باوجود پیسے کہاں اور کیسے چلے گئے؟ میں اس باب میں سوچتا رہتا اور مجھے ایسا لگتا کہ کہیں دادو نے تو کوئی سازش نہیں کی۔ بار بار مجھے محسوس ہوتا کہ ماسٹر کی آبرو کو خاک میں ملانے کے لیے اس نے یہ چوری کی ہوگی لیکن میرے پاس اس کا کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ اتنے دنوں تک چپ کیسے رہا۔ یہ بات بھی نہیں کہ گاؤں سے لوٹنے کے بعد راما مجھے ملا نہیں۔ وہ پاٹھ شالا میں آتا تھا مگر اس نے پیسوں کا نام تک نہیں لیا۔ راما اس خیال سے کچھ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ ماسٹر کے پاس پیسے اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح گھر کے صندوق میں ہوں۔ ابھی تبدیل نہیں ہوئے ہوں گے۔ تبدیل ہوتے ہی ماسٹر خود آ کر گھر پہنچا دے گا پھر میں کیوں منھ کھول کر بیکار پوچھوں اور اپنا اوچھا پن ظاہر کروں۔ اور میں بھی خاموش ہی تھا لیکن خود کو چور کی طرح محسوس کرتا تھا کہ راما گڈریے سے آنکھ نہ ملاؤں۔ اس سے بات کرنا بھی ٹال جاؤں۔ یہ گاؤں ہی چھوڑ دوں کہ ان میں سے کسی کے ساتھ ملاقات ہی نہ ہو۔ میں کچھ ایسا ہی پریشان اور اکھڑا اکھڑا تھا اور اپنے آپ سے بھی چڑتا تھا۔

اس درمیان میں مکھیا کی کالی کلوٹی پوتی ساڑی پھڑکاتے ہوئے میرے پاس آئی میں کمرے میں اکیلا ہی تھا۔ اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ ایک بار نہیں دو تین بار دیکھا اور منہ پر آنچل ڈالے باہر ہی کھڑی رہی۔ میں نے کہا "کون ہے ؟"

"میں انجا"

"مکھیا کی انجی ہو ؟"

"ہاں !"

"کیا کام ہے، بھیتر آؤ نا۔"

انجی شرماتی ہوئی اندر آئی۔ اس نے ہتھ کرگھے پر بنی ہوئی بھڑکیلی لال ساڑی پہن رکھی تھی۔ ہرے کپڑے کی چولی تھی۔ گاؤں میں اور مکھیا کے گھر پر میں نے اس چھوکری کو کبھی کبھار دیکھا تھا۔ مجھے اس کا احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ پُرکشش طور سے جوان ہے۔ چودہ پورے ہو کر اُسے پندرھواں ہی سال لگا تھا اس پر بھی وہ بیس کے آس پاس لگتی تھی اور ایسا ہی اُس کے ابھار سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔

انجی نے ایسے ہی آنچل سنوارا اور وہ لچک گئی اور بولی "ماسٹر جی! تحصیل کب جاؤ گے ؟"

ہفتہ ختم ہو رہا تھا۔ اگلے دن سنیچر تھا اور راما کے روپوں کے لیے تو مجھے گاؤں جانا ضروری ہی تھا۔ "کل صبح جاؤں گا، کیا بات ہے ؟"

"ہمارا ایک کام کر دیں گے ؟"

سنیچر کو میرے ذمے بہت سے کام ہوتے ہیں۔ کسی کی دوا لانا، کسی کا نوٹ بھنوانا، کسی کا منی آرڈر بھجوانا اور کسی کا خط ہوتا تھا۔

"کہو نا، کرنے کے لایق ہوگا تو کر دوں گا۔"

انجی بولی "میرے لیے یہ چولی سلوا کر لے آنا۔" اور میں گھبرا کر دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے ناپ کی خاطر پُرانی چولی اور ایک بڑھیا کپڑا میرے سامنے پھینک دیا۔

"چوری سے یہ کام کر رہی ہوں۔ ہمارے بڈھے سے مت کہیے گا۔ میں نے مزدوری کر کے یہ پیسے اکٹھے کیے ہیں جب یہ کپڑا لیا ہے۔ دو مہینے ہو گئے لیکن سِلوانے کی بات نہ بن سکی۔ سلوا کر لے آئیے تو سلائی کے پیسے میں دے دوں گی۔"

اور ہاں یا نہ کہنے سے پہلے ہی انجی وہ کپڑا اور وہ چولی وہاں پھینک کر چلی گئی۔

(۱۱)

سنیچر کی دوپہر کو گھر پہنچتے ہی میں نے موقع پاکر پیسے گم ہونے کی بات کا ذکر پتا جی سے کیا۔ میری بات کو ٹھنڈے دل سے سُن کر پہلے تو انھوں نے مجھے یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لیے قصوروار ٹھہرایا۔

میں نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے کہا "میں لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے یہ بار اٹھایا۔"

"لیکن تمھیں یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اگر یہ پیسے گم ہو گئے تو انھیں بھرنے کی ہماری حیثیت نہیں ہے اور گھر والے بھی اگر نہ بھر سکے تو آج تک کا حاصل کردہ سارا اعتماد مٹی میں مل جائے گا۔"

"یہ تو ہو ہی گیا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے لیکن میں آپ سے صلاح لے رہا ہوں۔"

پتا جی تھوڑی دیر چُپ رہے۔ بغیر کسی وجہ کے یہ زیر باری انھیں پسند نہیں تھی۔ آپ بھلے اور اپنا کام بھلا۔ پیسے جیسے جوکھم کے کاموں میں تو بالکل ہی نہیں پڑنا چاہیے۔ پیسے کی وجہ سے یقیناً بُرائی ہی ملتی ہے یہ ان کا ہمیشہ کا قول تھا۔ اس لیے اس نازل شدہ مصیبت کی بات کو سُن کر وہ پہلے تو سختی سے بولے لیکن پھر انھیں خود ہی محسوس ہوا ہوگا کہ اس چھوکرے سے یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ تم نے ہی یہ کام کیا ہے اب تمھیں اسے بھگتو۔

وہ بولے "تم اس مالک سے صاف صاف کہہ دو کہ پیسے چوری ہو گئے۔ آپ کے گاؤں ہی میں گئے سب لوگ مل کر تلاش کرو چوری کا ضرور پتہ چل جائے گا۔ وہ بہت بکنے لگے تو کہنا "میں کوئی اچکا نہیں ہوں، گھر بار کھیتی باڑی والا آدمی ہوں۔ سرکاری نوکر ہوں، تمھارے پیسے واپس کردوں گا۔" انھوں نے جو کچھ کہا مجھے بھی درست معلوم ہوا مگر رہ رہ کر مجھے یہ بات کھا رہی تھی کہ میں اس سے اس طرح کہہ نہیں پاؤں گا۔ راما بھی یقین نہیں کرے گا۔ گاؤں بھروسا نہیں کرے گا۔ پولیس کو خبر دینے سے بھی کچھ بات نہیں بنے گی۔ سپاہی بغیر وجہ کے گاؤں میں ہنگامہ مچائیں گے اور جسے چاہیں گے اُسے پکڑ کر مار پیٹ کریں گے۔ اس سے سارے گاؤں کو تکلیف ہوگی۔ اس سے تو بہتر یہ ہے کہ بتائے بغیر کہ پیسے گم ہو گئے ہیں اپنی جیب سے آسے دے دیں اور کان پکڑ لیں۔ یہ خیال دل میں پختہ ہونے لگا۔ پیسے کہاں سے ملیں گے؟ اس کا جوڑ توڑ شروع ہوا مگر کوئی بھی راہ نظر نہیں آرہی تھی۔ تین چار دوستوں، ایک دو ساہوکاروں سے مانگ کر دیکھا مگر مجھ چھوکرے کو اتنا قرض کون دیتا۔ کوئی پتا جی کی ضمانت مانگتا تو کوئی صاف انکار کر دیتا۔ گھومتے گھومتے میں تنگ آگیا۔ تین ساڑھے تین سو روپیہ بھی میں اکٹھا نہیں کر سکتا۔ یہ بات مجھے بری لگی اور میرا

منہ اتر گیا۔ اتوار کی رات کو میں نے کھانا تک نہیں کھایا۔ بڑی دیر تک نیند بھی نہیں آئی۔ میری اس گھبراہٹ کو ماں جان گئی اور اندھیرے میں ہی اٹھ کر میرے پاس آئی۔ دھیمی آواز میں بولی "راجارام! کیا ابھی تک جاگ ہی رہا ہے؟" میں نے 'ہوں' کہا۔ اسی وقت اس کی کھردری ہتھیلی میرے بدن پر پھر گئی۔

"دیکھو جو پیسے کھوئے ہیں وہ نہیں ملتے تو کیا، گڈریا بہت پیچھے پڑے تو تمھارے ننہال میں میرا جو گھر ہے اُسے بیچ دو۔ اس کے چار پانچ سو مل ہی جائیں گے۔ اتنی چنتا کی کیا بات ہے؟"

ماں کی بات سے میری ہمت بندھی۔ کوئی نہ کوئی تو میرے سر پر ہے۔ ضرورت ہو گی تو راما کے پیسے چکا سکوں گا۔ مجھے اس کا اندازہ ہو گیا۔ اور میں نے من ہی من میں یہ بات طے کر لی کہ جو کچھ گزر چکا ہے اُسے گاؤں کی سبھا میں رات کو پیش کر دوں گا۔ میں ماں کا گھر بھی بیچنا نہیں چاہتا تھا اور نہ راما کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ پیسے کھو گئے ہیں۔ میں ایک پھندے میں پھنس کر رہ گیا تھا اور ماں کو اپنے بے فکر ہونے کا یقین دلا کر سوموار کو پو پھٹتے ہی بنگرواڑی کی طرف چل دیا۔

سوموار کو پاٹھ شالا لگا کر میں اپنے کمرے میں آیا۔ میں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ رات کو لوگ اکٹھا ہوں گے تو انھیں چوری کی اطلاع دوں گا لیکن یہ کرنے سے پہلے میں نے سوچا کہ مکھیا کی صلاح لے لوں اس ارادے سے میں نے آیبو کو بوڑھے کی طرف بھیج دیا۔ اس کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے آجائیں کیوں کہ مجھے ایک ضروری کام ہے۔ آیبو چلا گیا اور میں بیٹھے بیٹھے سوچتا رہا کہ بوڑھے مکھیا کو یہ بات کیسی لگے گی۔ اتنا سب کچھ ہو چکنے پر بھی دل کے کسی گوشے میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ معاملہ مجھ کو مصیبت میں ڈالے گا۔ کوئی خاص بات ہوئے بغیر ہی الجھن آسانی سے سلجھ جائے گی۔ میں بے کار اسے ہوا بنا رہا ہوں۔ پیسے چوری نہیں گئے بلکہ بھول سے کہیں رہ گئے ہیں یا کھو گئے ہیں ...

میں نہیں بتا سکتا کہ مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا، مگر لگ ضرور رہا تھا۔ یہ بات قطعی درست ہے مجھے اس میں یقیناً ذرا بھی شک نہیں ہو رہا تھا کہ اس میں کوئی بھاری خطرہ ہے۔

آیبو بڈھے کے یہاں سے ناخوش ہی لوٹا۔ جب وہ ناخوش ہوتا تھا تو اس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے تھے، گال پھول جاتے تھے اور دونوں ہاتھ مڑ کر سینے پر آجاتے تھے۔ وہ دروازے کے اندر آہی رہا تھا کہ میں نے پوچھا "کیوں؟ کیا بوڑھا ملا نہیں؟"

"نہ ملنا کیسا۔ کیا وہ بھی کوئی پنت سرکار ہے؟"

"پھر کیا کہا اُس نے ؟"

"اس نے کہا ۔نہیں آتا ، جا کر اپنے ماسٹر سے کہہ دے کہ مجھے فرصت نہیں ہے۔ جس دن فرصت ملے گی ، آؤں گا۔"

لمحے بھر کے لیے میں ٹھنڈا پڑ گیا ۔ مجھے ایسی ذراسی بھی امید نہ تھی کہ بوڑھے کی طرف سے ایسا جواب آئے گا ۔ ہمیشہ ماسٹر ماسٹر کرنے والا عقل مند بوڑھا اس طرح جواب نہیں دے سکتا ۔ میں نے آبو سے پوچھا

"مذاق کر رہے ہو یا سچ مچ ایسا ہی ہوا ہے ؟"

"اس میں مذاق کس لیے ؟" آبو اچھا خاصا چڑ کر بولا ۔ آبو کے نتھنے غصے کے مارے پھول رہے تھے ۔ ماسٹر کے بلاوے کا گڈریا ایسا جواب دے یہ بات اس کے کلیجے میں چبھ چکی تھی ۔ وہ رُک کر پھر بولا "آپ سے بہت ناراض دکھائی دیتا تھا۔"

میں کچھ سمجھ نہیں سکا تھا ۔ بوڑھا کیوں بگڑ بیٹھا ہے ، مجھ سے کون سا قصور ہوا ہے ؟ ٹوپی پہن کر میں سیدھا بوڑھے کے گھر پہنچا ۔ چولھے کے پاس رکھے ہوئے مٹی کے دیے کی مدھم روشنی گھر میں تھی ۔ چولھے کے دھوئیں سے سارا گھر بھر گیا تھا ۔ انجی شام کی روٹیاں پکا رہی تھی ۔ میرے پہنچتے ہی اس نے نظر چُرا کر میری طرف دیکھا ۔ اس دیکھنے کا مطلب یہ تھا کہ بوڑھے کو نہ بتاؤں کہ میں نے چولی سلوائی ہے ۔ دیوار سے پیٹھ لگا کر اور گھٹنے کھڑے کر کے مکھیا بیٹھا تھا ۔ میرے پہنچنے پر اس نے یہ تک نہ کہا کہ آئیے ۔ اس چھوٹے سے گھر میں کھڑے کھڑے ہی میں نے کہا "کیوں بابا ، آپ کو فرصت ہے ؟"

بوڑھے نے صرف ہوں کہا اور چپ رہا ۔

مجھے بڑی جھجک محسوس ہوئی ۔ دھوئیں سے کالی ہوئی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے میں کھڑا رہا ۔ انجی کو بھی بڑی حیرت ہوئی ۔ ایک دوبار اس نے باری باری مجھے اور بوڑھے کو دیکھا ۔ اس کے چہرے پر تحیّر کے آثار تھے ۔ بوڑھے کے اس سلوک کا مقصد شاید اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ۔ چولھے کے لیے باہر سے ٹہنیاں توڑ کر لانے کے بہانے وہ باہر نکل گئی ۔ میں اور بوڑھا دونوں ہی وہاں رہ گئے ۔ وہ اسی طرح کھنچ کر بیٹھا رہا اور میں اس کشمکش میں کھڑا تھا کہ اب کیا کروں ۔

چولھے کی آگ بجھ چکی تھی اور دھواں زیادہ نکلنے لگا تھا ۔ اوپر ایک برتن میں سالن پک رہا تھا اس کی خوشبو بھاپ کے ساتھ واپس آ رہی تھی ۔ ابلنے کی آواز بھی آتی تھی ۔ دروازے سے

آنے والی ہوا کے جھونکے سے دیے کی لَو تھرّا رہی تھی، دیوار پر کالی پرچھائیں ہل رہی تھیں۔ میں کیا کہوں مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا پھر دھیمی آواز میں بولا "بابا! میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا، ایک ضروری بات بتانی تھی۔"

بوڑھے نے ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ انجی ٹہنیوں کی گچھی ہاتھ میں لے کر اندر آئی اور جھک کر چولھا جلانے لگی۔

بوڑھا کھنکھناتی ہوئی آواز میں بولا "جا چلا جا، مجھے کچھ مت بتا، میں نہیں سنوں گا!"

اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے نظرانداز کرتے ہوئے دروازے سے باہر ہو گیا اور اندھیرے میں اوجھل ہو گیا۔

اس بے عزتی سے میرا چہرہ پیلا پڑ گیا، کنپٹیاں گرم ہو گئیں۔ زہر کا گھونٹ پی کر میں باہر نکلنے لگا تب انجی ہلکی آواز میں بولی "اس حرام خور دادو نے نہ جانے بڈھے سے کیا کہہ دیا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیوں؟"

"کون جانے کیا بکا ہوگا۔ وہ بڑی آگ لگانے والا ہے۔"

میں نے سن لیا۔ جوان لڑکی گھر میں اکیلی ہو تو اس سے باتیں کرنا ٹھیک نہ جان کر اس سے کچھ کہے بغیر میں باہر نکل آیا۔ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا کمرے میں پہنچا۔ آبو دیا جلا کر بیٹھا تھا کچھ دیر ہم دونوں نہیں بولے سے نہیں بولے مگر سنی ہوئی بات کہے بغیر مجھ سے رہا بھی نہیں جا سکا۔

"دادو چغل خور نے مکھیا سے کچھ کہہ دیا ہے آبو! اس لیے وہ مجھ پر بگڑ رہا ہے۔" آبو کو ایسا لگا جیسے پہیلی حل ہو گئی ہو۔

"ایسی بات ہے؟"

"ہاں مجھے معلوم ہوا ہے اور یہ صحیح ہو بھی سکتا ہے۔"

"ہے ہی چغل خور۔ آپ سے بہت جلتا بھی ہے ماسٹر جی!"

"لیکن جلنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔"

"جب سے آپ گاؤں میں آئے ہیں اس کی غنڈہ گردی کو کوئی پوچھتا نہیں۔"

"وہ غنڈہ ہے؟"

"اور کیا؟ جیتا کس زور پر ہے۔ اِس کی ٹوپی اُس کے سر، اُس کی ٹوپی اِس کے سر۔ اچھا خاصا غنڈہ ہے وہ۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کسی ناول یا ناٹک کے بدمعاش کی طرح یہ چغل خور میرے پیچھے کیوں پڑا ہے۔ گویا اُسے مجھ سے فطرتاً دشمنی تھی جیسے کوّے اُلّو کی یا سانپ اور نیولے کی ہوتی ہے البتہ میرے گاؤں میں آنے کی وجہ سے اس کا رعب کم ہوگیا تھا۔ اس کی غنڈہ گردی کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ اس کی صلاح کوئی نہیں لیتا تھا اس لیے وہ میرا دشمن ہوگیا۔ اگر اس بات کو تسلیم کریں تو اس نے مجھے پہلی ہی ملاقات میں کیوں جھاڑ دیا تھا؟ شاید مجھ سے پہلے جو ماسٹر تھا اس نے کوئی قصور کیا ہوگا اور وہ ماسٹروں کی قوم سے ہی ناراض ہوگیا ہوگا لیکن میرا اتنے دنوں کا سلوک دیکھ کر تو اس کا غصہ مٹ جانا چاہیے تھا۔

آیبو اٹھا اور روٹی مانگنے کے لیے باہر نکل گیا۔ پہلے ہی راما گڈریے کے پیسوں نے میری نیند حرام کردی تھی اُس پر اس چغل خور کی پُرانی بیماری پھر ابھر آئی۔ شروع سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھنے والا گاؤں کا سب سے معزز آدمی مکھیا بھی ٹیڑھا ہوگیا تھا۔ کہاں میں نے تو یہ امید کی تھی کہ گاؤں میں کچھ اچھا کام کروں اور محکمے سے تعریف حاصل کروں کہ اتنے میں یہ واقعات ہوگئے۔

میرا من اُداس ہوگیا۔ اُٹھ کر کلّی کی۔ گھر سے جو پراٹھے لایا تھا انھیں کھولا اور اکیلا ہی کھانے لگا۔ وہ کھانے کی آواز بھی مجھے کچھ اچھی نہ لگی۔

اس دوران آنندا راموشی آیا اور دروازے کے باہر ہی کھڑے ہو کر اس نے پوچھا "ماسٹر جی! کیا اکیلے ہی ہو؟"

"ہاں اکیلا ہی ہوں۔ کیا بات ہے آنندا؟"

"کھا لیجیے، میں پھر آؤں گا۔"

"کھانا تو ہو چکا۔ کچھ کام ہے کیا؟"

میں نے پراٹھے لپیٹ کر رکھ دیے۔ ہاتھ دھوئے اور آنندا اندر آکر بیٹھ گیا۔ کمرے کا دروازہ اس نے بند کردیا۔ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا "کیا اس کمرے سے آپ کے روپے پیسے گئے ہیں؟"

مجھے یکایک دھکا سا لگا۔ جس بات کی کسی کو خبر نہ تھی اس کا پتہ راموشی کو کیسے لگا؟ اس کو کس نے یہ بات بتائی؟ چوں کہ اسے معلوم ہے کہ پیسے چوری چلے گئے ہیں لہٰذا وہ کس نے دیے تھے اور کیوں دیے تھے یہ سب کچھ اُسے معلوم ہو ہی گیا ہوگا۔ مطلب یہ کہ اتنے دنوں تک میں نے آبرو بچائے رکھنے کے لیے جو کوشش کی تھی وہ سب بیکار ہوگئی۔ تبدیل کرانے کے لیے راما نے جو روپے دیے تھے وہ میں کھائے بیٹھا ہوں۔ یہ بات ظاہر ہوگئی ہے۔ اب اسے صحیح بات بتا دوں یا ٹال مٹول

کروں اور اِدھر اُدھر کے جواب دوں؟ میں بالکل گھبرا سا گیا اور میرے منہ سے یہ الفاظ خود بخود نکل گئے۔ "ہاں، تمھیں یہ کس نے بتایا؟"

"میں جانتا ہوں۔"

"لیکن کیسے؟"

آنندا نے بڑے ٹھنڈے من سے کہا "میں ہی لے گیا تھا۔"

میں اپنے کانوں پر یقین نہیں کر سکا۔ منہ کھول کر بڑی بڑی آنکھوں سے ٹک ٹک دیکھتا رہا۔

آنندا نے دھوتی کی وہ پوٹلی کھولی جسے وہ ساتھ لایا تھا اور حفاظت کے ساتھ رکھے ہوئے روپے میرے سامنے رکھ کر بولا "جیسے لے گیا تھا ویسے ہی لے آیا ہوں۔ لیجیے یہ جوکھم۔"

میں پیسوں پر جھپٹ پڑا۔ انھیں اپنے قبضے میں کر لیا۔ من سے آگ کی طرح اٹھتا ہوا بوجھ ختم ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ میری مصیبت کے وقت یہ آنندا اموشی بھگوان کی طرح آ پہنچا ہے۔

پھر آنندا بولا "گن کر دیکھ لیجیے، میں تین روپے دس آنے کھا بیٹھا ہوں، وہ واپس نہیں کروں گا، باقی روپے آپ کے جوں کے توں ہیں۔"

اس راموشی پر مجھے غصہ بھی آیا اور پیار بھی۔

"آنندا روپے کیوں لے گئے تھے؟ تمھیں یہ کہاں ملے؟"

آنندا بولا "کھنڈوبا کی قسم۔ ماسٹر جی! میں روپے لے جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ روٹی مانگنے کے لیے آیا تھا مگر آپ سو رہے تھے۔ سوئے ہوئے کو کیسے جگاتا۔ روٹی کی جو پوٹلی آپ لائے تھے وہیں نظر آئی۔ اس کی خوشبو مار رہی تھی۔ سوچا کہ روٹی لے جاؤں تو انھیں ایسا لگے گا کہ کتا لے گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر چپ چاپ پوٹلی لے کر گھر چلا گیا۔ پوٹلی کھولی۔ اس میں روٹیاں تھیں اور ڈھیر سارے روپے بھی۔ انھیں دیکھتے ہی لالچ آ گیا۔"

"ٹھیک ہے، مگر ادھر میری گردن پھنس گئی۔"

"کہاں پھنسی ماسٹر جی! ذات کا بیرڑ۔ روپے پچا جانا بڑی بات نہیں تھی لیکن آٹھ دس روپے اپنے پاس رکھے اور لگاتار من میں آنے لگا بیٹا آنندا! ماسٹر جی کا پیسہ کیوں لیا؟ ماسٹر کیا جاگیردار ہے یا ساہوکار ہے؟ اسے یہ تکلیف کیوں دیتے ہو۔ ہمیشہ اس کے ہم نشین ہو کر یہ دغا کرنا ٹھیک نہیں ہے اور ماسٹر جی آج وہ روپے آپ کے قدموں میں پیش کرتا ہوں۔ آپ مقدمہ چلائیے، جیل میں بند کیجیے یا پھر کھلا چھوڑ دیجیے۔"

یہ ساری بات آنندا نے اتنی آسانی اور اتنے کھلے دل سے سنائی کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُسے کیا کہوں۔

چھوٹی چھوٹی چوریاں کرنے والے راموشی نے کافی بڑی منزل طے کرلی تھی لیکن اس نے خود بخود پیسے واپس بھی کر دیے تھے۔ پھر وہ میرے گھر میں روٹی کی چوری کرنے کے لیے ہی گھسا تھا روپے لے جانے کے کوئی ارادہ لے کر نہیں آیا تھا۔ روپے تو خود ہی اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ اب وہ یہ کہہ رہا تھا کہ مجھ پر رحم آنے کی وجہ سے اس نے یہ روپے واپس کر دیے مگر صحیح بات یہ نہیں ہوگی۔ چوری آج یا کل یقیناً کھل ہی جاتی، اس خیال کی وجہ سے آنندا شریف بن گیا۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرنے کے بعد مالک کے پاس جا کر دس پندرہ دن میں وہ اعتراف کر لیتا تھا۔ چوری کیا ہوا مال اتنی کم قیمت کا ہوتا تھا کہ چار گالیاں سنانے کے بعد کوئی بھی اُسے کچھ نہیں کہتا تھا کیوں کہ آنندا کہتا تھا کہ مانگنے سے کوئی دیتا نہیں اس لیے چپکے سے لے جانا پڑتا ہے اور میں زیادہ کہاں لے جاتا ہوں۔ پیٹ کو جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنا ہی مجھے چاہیے۔ چڑیاں کھاتی ہیں، پرندے کھاتے ہیں، کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں، اسی طرح یہ سمجھ لیجیے کہ آنندا کھا گیا اور رنج نہ کیجیے۔

پالتی مار کر آنندا میرے سامنے بیٹھا تھا اور اس کا دھیان اس طرف تھا کہ میں کیا کہتا ہوں۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے چاہا کہ پھر کبھی اس آدمی کا منہ نہ دیکھوں۔ اس کی بے وقوفی کی وجہ سے مجھے کتنی کوفت اٹھانی پڑی تھی۔ پچھلے آٹھ دن میری جان کیسے عذاب میں رہی تھی اسے میں ہی جانتا تھا۔

میں نے زور سے چلّا کر کہا "بڑے عقل مند ہو، جاؤ اب میں دوبارہ تمھاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔"

آنندا بالکل خاموش رہا۔ اس نے کان پر رکھی ہوئی آدھی بیڑی دیے سے سلگائی اور چلا گیا۔ میں اٹھا اور سیدھا راما کے گھر پہنچا۔ اس کے پیسے اس کے حوالے کیے اور آرام کی سانس لی۔

راما نے کہا "کوئی جلدی نہ تھی ماسٹر جی۔ پیسے آپ کے پاس تھے تو میرے ہی پاس تھے۔"

میں نے کہا "سچ ہے۔"

درمیان میں کیا ہوا اس کی اُسے کوئی خبر نہ تھی۔ لوٹتے وقت میں نے راما سے زور سے کہا "پیسے گھر میں مت رکھیے، کہیں لگا دیجیے، زمین لے لیجیے، اور بھیڑیں خرید لیجیے لیکن گھر میں ایسی جوکھوں مت رکھیے۔ بُرا وقت پوچھ کر نہیں آتا۔" کچھ دنوں کے بعد اس پیسے سے راما نے مزید

بھیڑیں خرید لیں اور اس کا ریوڑ بہت بڑا ہوگیا۔

(۱۲)

بارانی فصل کا باجرا آہستہ آہستہ بڑا ہوتا گیا۔ اس کے بھٹے پھوٹ آئے۔ سب کھیتوں سے ڈھکی ہوئی زمین پر بھورے رنگ کے بھٹے چاروں طرف لہلہانے لگے اور جلد ہی جامنی رنگ کے بور سے کھل اٹھے۔ بور چمکنے لگا اور بھٹوں پر چھوٹی چھوٹی چوٹیاں نمودار ہونے لگیں۔ بھٹوں کے گرد شہد کی مکھیاں اڑنے لگیں۔ پیلے رنگ کی تتلیوں کے جوڑے ہوا میں تیرتے ہوئے ان پر آکر بیٹھنے لگے۔ سنسناتی ہوئی ہوا میں بور اُڑنے لگا اور بھٹے اچھی طرح نمودار ہونے لگے۔ باجرے کے ساتھ بوئی گئی دالوں کی بیلیں پھیلنے لگیں۔ کہیں کہیں پھلیوں کے گچھے نظر آنے لگے۔ کلتھا لہلہانے لگا۔ تھوہر کے پودوں کی سالونی پھلیوں میں دانہ پڑنے لگا۔ مونگ پھلی کی جڑوں میں سفید گانٹھیں پڑنے لگیں۔ ہر ایک منڈیر پر اگی ہوئی خود رو گھاس کے سفید اور نیلے طرّے نکل آئے اور جلد ہی بور سے بھرے ہوئے بھٹے مکئی کے چمکیلے دانوں سے بھر گئے اور پرندوں کے جھنڈ ان چمکیلے دانوں کو کھانے کے لیے جھپٹنے لگے۔

جن کی زمینیں تھیں وہ لوگ صبح سویرے اٹھ کر رکھوالی کے لیے کھیتوں پر جانے لگے۔ بنگرواڑی کی عورتیں اور بچے مزدوری کے لیے پاس کے گاؤں کے کھیتوں پر جانے لگے۔

ہری ہری گھاس کھا کر بھیڑیں گول مٹول نظر آنے لگیں۔ ان کی چربی بڑھ گئی۔ کوئی گڈریا پیسے سے تنگ ہوتا تو ان کو بازار میں لے جاتا اور ان گول مٹول بھیڑوں کی اسے اچھی قیمت مل جاتی۔

باجرا اچھی طرح پک گیا۔ بچے تازہ دانا کھا کر موٹے تازے ہونے لگے۔ دسہرہ آیا۔ لوگوں نے مکئی کے نئے بھٹے بانٹے ۔۔ اور پھر کٹائی کا نیا دور شروع ہوگیا۔ پانچ مہینے سے باجرے کے جو پودے پل رہے تھے، درانتی کی کاٹ سے زمین پر لیٹ گئے۔ اگر انھیں ویسے ہی زمین پر رہنے دیا جائے تو چڑے اور چڑیاں ان کی بالیاں کھا جائیں گی۔ اس خیال سے لگے ہاتھوں ان کے پولے بنا کر، جھونپڑی میں لے جا کر ان کے ڈھیر لگا دیے گئے۔ جب ان پر وبا ڈپڑا اور اس کے ساتھ ہی موگری کا زور پڑا تو ان بالیوں کے ان چھوٹے دانے باہر نکل آئے۔ پھر تو تین دن بعد ہی ڈھیروں کو کھول کر ان کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بنائی گئیں اور انھیں دھوپ میں رکھ دیا گیا۔ گیلے دانے سوکھنے لگے، صبح شام چڑیاں وہاں جمع ہونے لگیں۔

جسے زیادہ ضرورت تھی اس نے بالیوں کو توڑا اور دُھن ڈالا۔ گھر کے جانور جوار کی کٹی

کھانے لگے۔ گھر کے لوگ تازہ باجرے کی روٹیاں کھانے لگے۔ جن کے گھر میں کھانے کو تھا انھوں نے جلدی نہیں کی اور دوسرے کام نپٹانے کے لیے باجرہ نکالنے میں ڈھیل کر دی لیکن آج نہیں تو کل انھیں بھی ان چھوٹی ڈھیریوں کو کھولنا لازم تھا۔

آہستہ آہستہ دالوں کی پھلیوں کی باری آئی۔ سوکھی پھلیاں جھن جھن بجنے لگیں۔ پھر کلتھا نکلا۔ مونگ پھلی نکلی۔ تھوہر نکلی۔ خالی کھیتوں میں جانور گھسنے لگے۔ بھیڑیں اِدھر اُدھر جو کچھ ملے کھانے لگیں۔ باجرے کے بھورے لال کھیت اُجڑے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ کڑاکے کی سردی پڑنے لگی۔ لوگ صبح شام کوڑا کرکٹ جمع کرتے اُسے جلاتے اور تاپتے۔ ان کے ہونٹھ اور منھ سردی کے مارے پھٹ گئے۔ گڈریوں کے جسم کالے کمبلوں سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ صبح کے وقت پانی کے صاف چشموں یا تالابوں پر بھاپ دکھائی دیتی تھی

اسی درمیان میں ساون کے مہینے کی بوئی ہوئی جوار بڑھ گئی۔ کالی مٹی سے اٹھ کر جوار کے پودے گھٹنوں تک آگئے۔ بیچ بیچ میں بوئے ہوئے کریلے کی قطاریں بڑھیں۔ چنے کے چھوٹے چھوٹے جامنی رنگ کے پھول کھلے۔ دیکھتے دیکھتے جوار کے بھٹے دکھائی دینے لگے۔ کریلوں کے کھلے ہوئے پھول بڑے خوب صورت تھے۔ چنے کے پودوں پر چنے آنے لگے۔

جوار کی ہری کٹی کھا کر جانور گول مٹول ہو گئے اور ان کے جسم چمکنے لگے۔ وہ اپنے سینگوں سے مٹی اچھالنے لگے پکے ہوئے گنّے اور ہرے چنے کے لیے بچے چوریاں کرنے لگے۔ رکھوالے کی آنکھ بچا کر بھیڑ بکریاں جوار کے پودوں کو نوچنے لگیں۔ بچے جن کے ہاتھ چپ چپے ہوتے اور منھ پر سفید خراشیں ہوتیں، کھیتوں میں ہڑبونگ مچاتے ہوئے پھرنے لگے۔ جگہ جگہ چنے کے پودوں کی آگ جلی اور ہولے بنائے گئے۔ صبح سویرے کھیت کھیت میں جلنے والی اسی آگ کا دھواں آسمان کی طرف چڑھنے لگا۔ جوان چھوکروں نے بھنے ہوئے چنے کی خوراک شروع کر دی۔ بڑے بوڑھے بھی ہاون دستہ میں کوٹ کر ان کا ذائقہ چکھنے لگے۔ عورتیں اور بچیاں بھی وقت نکال کر دو چار دانے چبا لیتی تھیں۔

ہر سال انھیں دنوں پردیس سے آنے والی چڑیاں کسی خبر کی طرح آجاتیں۔ سورج کے نکلتے ہی یا نکلنے سے پہلے دور سے ٹائیں ٹائیں کی آواز سنائی دینے لگتی۔ صاف نیلے آسمان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اڑنے لگے۔ اڑتے اڑتے ان کی لمبی لمبی قطاریں الگ الگ صورت اختیار کرنے لگیں۔ آنگن میں یا کھیت میں کھڑے بچے اوپر کی طرف منھ کر کے کچھ اس طرح چلّانے

لگے گویا ایک ہی لے میں گا رہے ہوں۔ " سینکیا سارس بارہ بیلوں کا ہل چلا، ہل چلا! کسان اپنے صافوں کو اوپر آسمان کی طرف اچھال کر ان پرندوں کو ڈرانے لگے تاکہ یہ اناج ترکاری کو نوچ ناچ کر فصل خراب نہ کر دیں۔ پھر بھی لمبی لمبی ٹانگوں والے یہ پرندے اڑتے ہوئے گھوم گھام کر فصل پر ٹوٹنے لگے اور شور مچاتے ہوئے جوار کے بھٹوں کو نوچنے لگے۔ تین تین مرغیوں کے برابر وزن کے چربی سے بھرے ہوئے ان جانوروں کو دیکھ کر راموشیوں کی رال ٹپکنے لگی۔ غلیل اور گوپیے لے کر ان کے نوآموز بچے اس اونچے میدان کے کھیت پر سارسوں کا پیچھا کرنے لگے۔ آخر بڑے دنوں کے بعد راموشیوں کی جھونپڑیوں سے پکتے ہوئے گوشت کی بو آنے لگی۔ کریلے کے پھولوں کا شہد جمع کر کے شہد کی مکھیوں نے ٹیڑھی بیڑھی جگہوں پر چھتے بنائے۔ پیڑ کاٹنے کے لیے گڈریوں اور راموشیوں کے بچے کلہاڑیاں لے کر جنگل میں گھومنے لگے اور جھاڑیوں میں بنے ہوئے چھتے ڈھونڈ کر چھتوں کو گرانے اور میٹھا شہد کھانے لگے۔

پھر جوار اور کریلے کی فصل آئی، چنا آیا، کھلیانوں کی دھوم دھام شروع ہو گئی۔ لوگوں نے کھلیان لیپے، بٹائی ہوئی، موگری سے بھٹوں کو کوٹا اور پھر ہوا میں اڑایا۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بھوسا اڑ گیا اور موتیوں جیسی جوار کے ڈھیر لگ گئے۔ فصل میں سے اپنا اپنا حصہ مانگنے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ فصل کا ناپ تول ہوا۔ چڑیوں، جانوروں اور چوروں سے بچا کر کسان اناج کو اپنے گھر لے گئے۔

پھلی اور چنے وغیرہ کے کھیت خالی ہو گئے۔ کھیتوں میں گھوم گھام کر غریبوں نے جو کچھ بچا کھچا یا گرا پڑا ملا، اٹھا لیا۔ ان کی نگاہوں سے بچے ہوئے دانے چڑیوں نے چگ لیے۔ چڑیوں کے بعد پھر بھی جو بچ گئے وہ زمین پر پڑے رہے اور بارش کا انتظار کرنے لگے۔

دس مہینے بعد کھیت پھر قدرے سفید قدرے سیاہ نظر آنے لگے۔ فصلوں کا موسم ختم ہو گیا۔ پرندے اڑ گئے۔ داڑھ کے نیچے تمباکو دبا کر لوگ گھنٹوں فرصت سے بیٹھنے لگے۔ نٹ آکر قلابازیاں دکھانے لگے۔ مداری بھالو کے کرتب اور بازی گر ہاتھ کی صفائی۔ یہ کھیل دیکھ کر لوگ جی بہلاتے اور ہنستے تھے۔ اور خوش ہو کر سیر سوا سیر اناج بازی گر، مداری اور نٹوں کو دے دیتے تھے۔ گڈریوں کے ہنرمند چھوکرے اکٹھے ہو کر گجی کا رقص کرنے لگے۔ انھوں نے کالے رنگ کی بنڈیاں پہن رکھی تھیں جن پر کانچ کے ٹکڑے ٹنکے ہوئے تھے اور سفید دھاگے سے موروں اور بیلوں کی شکلیں بنا رکھی تھیں۔ ہاتھ میں رنگا رنگ رومال لے کر دائرہ بنایا۔ ایک بڑا بھاری ڈھول لیے ہوئے ڈھول والا تاک دھنا دھن کرنے لگا۔ کھرتال والا کھرتال بجانے لگا۔ ہرے لال رومالوں کو لہراتے ہوئے گڈریے پیروں کو آگے پیچھے نچانے لگے۔ ہاتھی کی رفتار سے ناچ شروع ہوا۔ آہستہ آہستہ رفتار بڑھتی گئی۔ پیر تیزی سے پڑنے لگے۔ نیلے جامنی رومال اڑنے لگے۔

ڈھول کی آواز گونجنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے وہ پچیس تیس گڈریے اور وہ ڈھول والا سب ایک ہی تصویر بن گئے۔ مجموعی حیثیت سے ایک ہی آکار تھا۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی ہوشیار اور ماہر آدمی اکیلا ہی والہانہ انداز سے ناچ رہا ہے۔

کمبل بچھا کر بیٹھے ہوئے گڈریے، دروازے میں کھڑی ہو کر دیکھنے والی عورتیں، بچے، سب سدھ بُدھ کھو بیٹھے۔ وہی روح ان کے جسموں میں بھی سما گئی۔ وہی رفتار ان میں بھی آ گئی۔ ساری بنگرواڑی ناچنے لگی تاک دھنا دھن، تاک دھنا دھن!

(۱۳)

آپ ہی آپ بگڑے ہوئے مکھیا نے مجھ سے کئی دن تک بات نہیں کی۔ کبھی آ کر پاٹھ شالا میں نہیں بیٹھا، میرے کمرے میں کبھی نہیں آیا۔ میری بابت کسی سے پوچھ تاچھ کرنا بھی چھوڑ دیا۔ اوّل اوّل تو یہ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا لیکن بعد میں مَیں نے بھی اُسے نظر انداز کر دیا۔ مجھ پر بھی تھوڑی سی خودی طاری ہو گئی۔ میری کوئی غلطی نہ ہوتے ہوئے اچانک ہی یہ بوڑھا مجھ سے بگڑ گیا۔ اس چغل خور کی چغلی سُن کر مجھ سے بات چیت تک بند کر دی۔ مجھے اس کا برتاؤ بہت بُرا لگا۔ میں نے اپنے آپ بوڑھے سے بات کرنے کی کوشش کا خیال ہی ترک کر دیا۔

پاٹھ شالا کا کام کافی بڑھ گیا تھا۔ بچے خوب آ رہے تھے۔ ان کے امتحان، پڑھائی اور حاضری کی طرف مجھے اب زیادہ دھیان دینا پڑ رہا تھا کیوں کہ بڑے افسر بھی آنے جانے لگے تھے۔ دیہات میں پاٹھ شالائیں کھولی ہیں تو ان کی کامیابی یا ناکامیابی دیکھی جانی چاہیے، محکمۂ تعلیم کو یہ احساس ہو گیا تھا۔ اوپر سے طرح طرح کی خبریں آتی تھیں، احکام جاری ہوتے تھے، فصل کی چھٹیوں میں بچے بکھر گئے تھے۔ ان کو اکٹھا کر کے انھیں پھر سے پاٹھ شالا میں باقاعدہ لانے کا مشکل کام آبو کر رہا تھا۔ آبو ہی نہیں راما گڈریا اور آنندا راموشی بھی کر رہا تھا اور گاؤں بھی اب میری بات کو ٹالتا نہیں تھا۔ پاٹھ شالا اور ماسٹر کے ساتھ گاؤں بھر کو ایک اُنس ہو گیا تھا۔

ایک دفعہ سوموار کو میں پاٹھ شالا گیا تو بچوں نے یہ خبر سنائی کہ تیسری جماعت میں اوّل رہنے والے 'سُتا' نے اکیلے ہی بھیڑیے کو مار ڈالا۔ مجھے بڑا اچنبھا لگا۔

"کیسے مارا؟"

"ببول کاٹنے کی کلہاڑی سے مار گرایا۔"

"ماسٹر جی، اس کے گھر کے سامنے دیکھیے، بھیڑیے کی کھال اُس نے ٹانگ رکھی ہے۔"
"سُتا کہاں ہے؟ پاٹھ شالا نہیں آیا کیا؟"
"ماسٹر جی! اب وہ پاٹھ شالا میں نہیں آئے گا۔ اُس کے باپ نے اُسے بھیڑوں کے پیچھے لگا دیا ہے۔"

رات کو پاٹھ شالا کے سامنے جب منڈلی جمی تو میں نے پوچھا کیا سُتا نے سچ مچ اکیلے ہی بھیڑیے کو مار ڈالا ہے؟ تو اور لوگوں نے اس کی حقیقت مجھے تفصیل سے سُنائی۔

واڈی کے پاس جنگل میں ایک دو بھیڑیے ہمیشہ رہتے ہیں۔ اکا دُکا ریوڑ دیکھ کر وہ بھیڑ کو پکڑ کر لے بھاگتے ہیں۔ اچھی بھیڑ ہو تو رکھوالا اس کا پیچھا کرتا ہے اور بھیڑیے کو منھ کا نوالا چھوڑ دینے پر مجبور کرتا ہے۔ اس مری ہوئی بھیڑ کو مہار تھوڑی بہت قیمت دے کر خرید لیتے ہیں اور کھا جاتے ہیں لیکن کئی بار بھیڑیا بھیڑ لے جاتا ہے اور گڈریا خالی ہاتھ واپس آجاتا ہے۔ ایسے واقعات بار بار ہوتے تھے۔ زیادہ دقت ہونے لگتی تو ایک آدھ دن کے لیے گاؤں کے دس بیس چھوکرے لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کر نکل پڑتے۔ چلچلاتی دھوپ میں اونچے میدان کو روند ڈالتے۔ دو ٹولیوں میں بٹ کر بھیڑیے کو گھیرنے کی کوشش کرتے، لیکن کاٹیاں بھیڑیا ہاتھ نہیں آتا تھا۔ دن بھر گشت کرتے ہوئے یہ شکاری قسم کے لوگ کسی کے کھیت کا چنا کسی کی مونگ پھلی اکھاڑ کر کھاتے ہوئے خالی ہاتھ واپس آجاتے۔ پھر پانچ سات دن میں ایک آدھ میمنے کے مارے جانے کی خبر آتی۔ اتنی تکلیف ہونے کے باوجود بھیڑیے کو مار ڈالنے کی کوئی خاص کوشش نہیں ہوتی تھی کیوں کہ بھیڑیا کھایا نہیں جاتا اس لیے رامو شی اس کے شکار کے لیے زیادہ بے تابی نہیں دکھاتے تھے اور گڈریے بھی اس بات کو مانتے تھے کہ ریوڑ کی بھیڑ کو بھیڑیا پکڑے تو بھیڑوں کو چھوت کی بیماری نہیں ہوتی اس وہم کی وجہ سے بھیڑیے اور بھی ڈھیٹ ہو جاتے اور دن دہاڑے کھیتوں میں گھومتے پھرتے لیکن آدمی کو دیکھتے ہی مٹی کھودنے لگ جاتے۔

برا گڈریے کو کسی کام سے دوسرے گاؤں کو جانا تھا۔ اسی لیے اس نے بیٹے کو بھیڑیں چرانے بھیج دیا۔ لکڑی اور کلہاڑی لے کر سُتا پٹھار (میدان) میں بھیڑیں چرا رہا تھا کہ شام کے وقت بھیڑیے نے پولوں کے لگے ہوئے ڈھیر پر چڑھ کر ریوڑ کی ٹوہ لی۔ درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے نالے کے کنارے کنارے وہ ریوڑ کے پاس آپہنچا۔ اس پر بھی سُتا کو پتہ نہیں چلا۔ آخر ریوڑ سے الگ پڑی ایک موٹی تازی بھیڑ دیکھ کر بھیڑیا جھپٹ پڑا۔ اس کی گردن دبا کر وہ بھاگنے لگا۔

سُتا کا کتا زور سے بھونکتے ہوئے دوڑا۔ جب کہیں سُتا کا دھیان اُدھر گیا۔ بھیڑیا نالے کے کنارے تیزی سے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

تند و تیز گالیاں بکتا ہوا سُتا اس کے پیچھے دوڑا۔ کتا بھی ڈور پڑا۔ دیکھتے دیکھتے کتا بھیڑیے سے جا بھڑا اور اس نے کود کر بھیڑیے کے پچھلے پیروں کے جوڑ کو پکڑ لیا۔ درد اٹھتے ہی منہ میں پکڑی ہوئی بھیڑ کو چھوڑ کر بھیڑیا پیچھے کی طرف مڑا اور دانت نکال کر کتے کی گردن پکڑنے لگا اور اپنی ٹانگیں چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے رٹ پٹانے لگا۔ لیکن جس طرح بھیڑیا مڑ رہا تھا اسی طرح کتا بھی مڑتا جا رہا تھا۔ منہ میں دبائی ہوئی ٹانگوں کو کھینچتے ہوئے کھسک رہا تھا۔ دونوں طرف رڑنے کے بعد بھی کتے کی گردن بھیڑیے کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ دونوں خوب گتھم گتھا ہوئے۔ گرداڑی، بھیڑیے کی طاقت کتے سے زیادہ تھی۔ اس نے کتے کو گھسیٹا اور جھٹکا۔ دانتوں کی گرفت چھوڑ کر کتا الٹا جا گرا اور خشمگیں بھیڑیے نے کود کر اس کی گردن پھاڑ ڈالی۔ کتا نہایت دردناک آواز سے چیخا اسی درمیان میں سُتا وہاں جا پہنچا اور کتے کی چھاتی پر سوار بھیڑیے کی گردن پر اس نے کلہاڑی کا وار کر دیا۔ خون کے فوارے پھوٹ نکلے۔ بھیڑیا الٹا ہو گیا اور پیر جھٹکنے لگا۔ غصے سے بھرا ہوا سُتا وار پر وار کرتا رہا۔

بھیڑیا مر گیا، کتا بھی مر گیا۔ اُسی نالے کی ریت میں گڈھا کھود کر سُتا نے کتے کو دبا دیا۔ آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ پھر اس مری ہوئی بھیڑ کو کندھے پر لاد کر اور بھیڑیے کے پیر میں رسی باندھ کر اُسے گھسیٹتے ہوئے چراغ جلنے کے وقت سُتا لوٹ کر واڑی پہنچا اور جو کچھ گزرا تھا اس کا احوال ماں کو سُنا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اس لیے کہ کتا بھی کھویا اور بھیڑ بھی کھوئی۔ اس کی ماں نے بھی روتے روتے اُسے تسلی دی اور اسے چھاتی سے لگا کر بولی "جانے دے کتے کو، اگر وہ مرا بھی تو بھیڑیے کا خون بہا کر مرا۔ اس پر میں نے بھیڑ نچھاور کر دی۔ روتا کیوں ہے؟"

یہ احوال سُن کر مجھے خیال آیا کہ سُتا پاٹھ شالا کب آئے گا اور میں کب اُسے شاباش دوں گا۔ لیکن چار پانچ دن بیت گئے پھر بھی وہ پاٹھ شالا نہیں آیا۔ پیغام بھیجے تو جواب ملا کہ وہ بھیڑیں چرانے جاتا ہے، پاٹھ شالا نہیں آئے گا۔ پھر فرصت نکال کر میں دانستہ ان کے کھیت میں بنے ہوئے مکان پر جا پہنچا۔

دن ڈوب چکا تھا اور ہلکی چاندنی پھیل رہی تھی۔ بستی کے نزدیک آتے ہی خیال آیا کہ کتا لپکے گا اس لیے ستا کو پکار لوں۔ میں نے زور سے پکارا

"او سَتا!"

گھر کی طرف سے آواز آئی "کون ہے؟"

"میں ہوں ماسٹر، کہیں کتا چڑھ نہ آئے۔"

سَتا کی آواز یکایک نیچے اتر آئی "ماسٹر جی! کتا کہاں ہے، آجائیے۔"

اور یکایک مجھے خیال آیا کہ سَتا کا کتا تو بھیڑیے سے الجھتے ہوئے مرگیا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں بڑا گنہ گار ہوں۔

گھر کے سامنے اچھی طرح لپا ہوا آنگن تھا۔ مٹی کا ایک بے ڈھب سا گملا تھا۔ اس میں تلسی کا گھنا پودا تھا۔ اُس چبوترے پر کمبل بچھا کر ستا نے کہا "بیٹھیے" ہلکی چاندنی میں جانور چارہ کھاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ سَتا کا باپ بیڑی پیتے ہوئے بکری دوہ رہا تھا۔ باہر کے باڑے میں بھیڑیں بند تھیں۔ مویشیوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

"بھائی تو نے بڑی بہادری کا کام کیا ہے، مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔"

ستا بولا "مگر بھیڑیے نے کتے کو مار ڈالا ماسٹر جی۔"

"ہاں یہ بھی مجھے معلوم ہو گیا ہے۔"

پھر ایک لمحے کے لیے میں خاموش ہو گیا۔ سَتا بھی چُپ رہا۔ برا دودھ کی منکی لے کر میرے سامنے آیا۔

"دودھ دوہ رہا تھا، رات کو کیسے آئے؟"

میں نے کہا "گھومتا پھرتا چلا آیا۔"

"بیٹھیے، ہمارے یہاں چائے وائے تو ہے نہیں، کیا دودھ پئیں گے؟"

"دودھ یا چائے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ایسا کہنے سے کب کام چلتا ہے۔ لیجیے نا، ہماری بات رکھ لیجیے۔ جا چھوکرے اندر سے گلاس لا۔"

برا میرے برابر ہی چبوترے پر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا "چار دن سے سَتا پاٹھ شالا نہیں آرہا ہے۔"

"نہیں آیا۔ میں نے ہی کہا تھا کہ بھیڑیں لے جاؤ۔"

"اگر کام پورا ہو گیا ہو تو کل سے بھیج دیجیے۔"

برا کچھ ہنسا۔ اس نے گلاس میں ڈال کر دودھ میرے سامنے رکھا اور سَتا سے کہا کہ منکی

اندر لے جائے۔

وہ نہایت ہی خوش ذائقہ دودھ تھا جسے میں نے مزے لے لے کر پی ڈالا۔ بکری کے دودھ میں تھوڑی سی بو تو ہوتی ہے مگر عادت پڑ جانے کی وجہ سے اب محسوس نہیں ہوتی تھی۔

پھر برا آرام سے بولا "ماسٹر جی! اب سُتا پاٹھ شالا میں نہیں آئے گا۔ میں نے ہی کہہ دیا تھا بہت ہو چکی پاٹھ شالا، اب اپنے کام میں لگو۔"

"لیکن یوں اچانک ہی کیوں نکال لیا۔ ساتویں تک تو اسے پڑھنے دیجیے۔"

برا نے گردن ہلا کر کہا "کیا کرنا ہے؟ اجی اب تو اچھا خاصا جوان ہو گیا ہے، اس نے اکیلے ہی بھیڑیے کو ختم کر دیا۔ بچہ نہیں رہ گیا ہے اب وہ۔ پھر اب پاٹھ شالا کیوں اور سلیٹ کس لیے؟ اپنے کام میں لگ جانے دیجیے۔"

میں نے بہت کہا مگر بیٹے کے مزید چار سال گنوانے کے لیے برا رضامند نہیں ہوا۔ بار بار اس نے سختی سے کہا "اب میں اپنے بیٹے کو پاٹھ شالا نہیں بھیجوں گا۔ اب میرے ساتھ ایک اور ساتھی ہو گیا ہے۔ میرا کام بھی اب جلدی ختم ہوا کرے گا۔ آپ زور نہ دیجیے۔"

پاٹھ شالا میں جانے کے لیے سُتا نے بھی خاص ضد نہیں کی۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ بحث کرنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا اور کھیت کی کھلی اور ٹھنڈی ہوا کو برداشت کرتا ہوا گاؤں کی طرف چل دیا۔ میرا من اُداس ہو گیا۔

دوپہر کو اسکول ختم ہو جانے کے بعد ایک دن میں نہانے کے لیے گاؤں کے باہر بنے ہوئے کنوئیں کی طرف جا رہا تھا کہ بوڑھا مکھیا میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ ایک دو بار میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ چلا ہی آ رہا تھا۔ تپتی ہوئی زمین پر دوپہر کی کڑی دھوپ بڑی تیز معلوم ہو رہی تھی اور ننگے بدن دھوتی کو کس کر باندھے ہوئے مکھیا ایک مینڈ سے دوسری مینڈ پر چل کر میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ پہلے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کہیں کام سے جا رہا ہو گا لیکن جب میں مینڈ چھوڑ کر ڈھیلوں کو روندتا ہوا کنوئیں کی طرف جانے لگا تو اس نے بھی مینڈ چھوڑ دی، ڈھیلے روندتا ہوا وہ بھی کنوئیں کی طرف ہی چلنے لگا۔ نہانے کے لیے آیا ہو ایسا نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے پاس لوٹا یا دھوتی کچھ نہیں تھا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ دوبارہ پیچھے دیکھے بغیر میں کنوئیں کے قریب پہنچ گیا۔ کپڑے اُتارے اور لنگوٹ باندھ کر اندر اتر گیا اور پانی میں جا گرا۔ تھوڑی دیر تک ڈبکیاں لگا کر اوپر آ بیٹھا اور جسم کو رگڑنے لگا۔

بوڑھا مکھیا بھی سیڑھیاں اتر کر اندر آیا اور جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے دو سیڑھیاں چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر رُک کر بولا " ایک گاؤں میں رہ کر ایک دوسرے سے بات نہ کرنا ٹھیک نہیں ہے!

خود بخود وہ اس طرح بولا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا " بابا بات کرنا آپ نے بند کیا تھا، میں نے نہیں۔"

"ارے کیوں نہیں بولتا، کس وجہ سے نہیں بولتا یہ کبھی تو نے پوچھا بھی؟"

"کیوں پوچھتا؟"

"کیوں، اس میں تیری کچھ ہیٹی تھی؟ ارے عزّت اور ہتک کا خیال تو ہم بڑے بوڑھوں کو کرنا چاہیے نہ کہ تم جیسے کل کے چھوکروں کو۔"

اس بات پر میں کچھ ہنسا۔ مجھے بھی یوں کھنچے کھنچے نہیں رہنا چاہیے تھا۔ ذرا عقل مندی سے بوڑھے سے بات کرتا تو وہ ضرور وجہ بتا دیتا۔ پھر بوڑھا خود ہی کہنے لگا

" مجھے چغل خور نے کہا تھا کہ تو نے ہماری انجی کو چولی دی ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟"

میرا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے کچھ نہیں سوجھا کہ کیا جواب دوں۔ بوڑھا ایسی بات پوچھ بیٹھے گا اور اس کے بات نہ کرنے کے پیچھے کوئی ایسی وجہ ہو گی مجھے اس کا دھندلا سا بھی خیال نہ تھا۔ کبھی کسی وقت میں نے انجی کو چولی لا کر دی تھی، میں یہ بات بھول چکا تھا۔ جب میں کچھ جواب نہ دے سکا تو بوڑھے نے مزید کہا کہ اس نے ہنومان جی کی پیڑھی چھولی۔ تمھیں چولی دیتے اور انجی کو ہنستے ہنستے لیتے ہوئے اس نے دیکھا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی میری تو عقل گم ہو گئی۔ میں نے چھوکری کو بے حساب پیٹا اور تجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا لیکن میری نظر تم پر تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک مجھے تم میں کچھ غلط سلط نظر نہیں آیا۔ پھر سوچا ایک بار جھوٹ سچ کا فیصلہ کریں۔"

" جھوٹ ہے، صاف جھوٹ ہے۔ چغل خور نالائق آدمی ہے۔ آپ میں اور مجھ میں جو اپنا پن تھا اس سے دیکھا نہیں گیا اس لیے اس نے میرے خلاف یہ سازش کی۔

میری سانس تیزی سے چلنے لگی اور دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی۔

بوڑھے نے کہا " تو یوں کہو کہ چولی دینے کی بات جھوٹ ہے۔"

" میں نے چولی دی تھی مگر مفت میں نہیں۔ انجی نے مجھے کپڑا لا دیا تھا اور تحصیل سے چولی سلوا لانے کو کہا تھا۔ میں نے آپ سے نہیں کہا کیوں کہ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ چوری سے سلوا رہی ہوں، بوڑھے سے مت کہنا۔ چاہو تو میرا اس کا آمنا سامنا کروا دو۔ میں ایسا نالائق آدمی نہیں ہوں۔ کسی

کا کوئی بھی کام ہو میں چپ چاپ کر دیتا ہوں۔ سب کے کام آتا ہوں۔ اس احسان کا بدلہ آپ لوگ اس طرح چکائیں گے مجھے اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ مجھے کسی بات کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اسکول کا کام کاج کرنے میں مگن رہ سکتا ہوں۔ بچوں کو چار لفظ سکھا پاؤں گا بس یہی بہت ہے۔"

میں نے یہ سب کچھ اتنی جلدی جلدی اور روکھے پن سے کہا کہ بوڑھا حیرت زدہ رہ گیا۔

"دیکھو کیا میں نے اسے سچ مان لیا تھا، اور تجھ سے کوئی ایسی بات کی یا تجھ سے کوئی بُرا سلوک کیا؟ مجھے ہی وہ باتیں سچ نہیں لگ رہی تھیں اور اس پر تو نے آج صاف بتا ہی دیا۔ وہ چغل خور اول ہی سے تمھارا بُرا چاہتا ہے۔ اسی کمبخت نے تورائی کا پہاڑ بنا دیا ہے۔ تیرے من میں تو پاپ نہیں ہے نا؟"

میں اب بھی تاؤ میں تھا۔ بات تو الٹی بوڑھے پر ہی پڑی تھی۔ یہ بات اس کی بات چیت اور چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اب تو مجھے اور زیادہ تاؤ آگیا۔

"ہاں اور لو چھپے میرا کیا قصور ہے۔ سمجھ دار آدمی کے لیے تو آپ کے گاؤں میں رہنا بھی پاپ ہے۔ آپ لوگ اچھے بھلے آدمی کو بھی بے وقوف بنا دیں گے۔ اب تو جتنی ہو چکی اتنی نوکری کافی ہے۔ میں عرضی دے کر کسی اور گاؤں میں تبادلہ کروا لیتا ہوں۔"

آخر میں میں یہ کہہ کر اوپر چلا آیا۔ کپڑے پہن کر گھر کی راہ لی۔ بوڑھا کافی دیر تک سیڑھی پر بیٹھا رہا اور مجھے پتہ نہیں وہ کب کب واپس آیا۔

اس روز میرا غصّہ دن بھر کم نہیں ہوا۔ عقل مندی سے کام لینے کی بہت کوشش کی مگر اس چغل خور سے بدلہ لینے کا خیال میرے دل سے دور نہیں ہوا۔ مجھے بار بار یہ خواہش ہوئی کہ اُسے پکڑ کر پیٹوں لیکن میرے جیسے کمزور آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس پر کوئی تہمت لگا کر جیل میں بند کرا دوں۔ اور نہیں تو کم سے کم جان پہچان والے تھانیدار سے کہہ کر کچھ مار پڑوا دوں اور اچھی خاصی دھونس جما دوں۔ میں اپنے آپ کو بہت گرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

میری اس حالت کو آبو نے جان لیا۔ اسے اس کا تو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ بات کیا ہوئی اور مجھ سے پوچھنے کی بھی اُسے ہمت نہ تھی اس لیے وہ خاموش رہا اور کچھ بولا نہیں۔ آخر رات کو پڑے پڑے میں نے ہی اس سے کہا "آبو، اس چغل خور نے بڑا نقصان کیا ہے۔"

آبو دروازے کے پاس چادر اوڑھے پڑا تھا اس نے کہا "ماسٹر جی! ایک بار اُسے ایسا سبق دیجیے کہ یاد رکھے۔"

"سبق دینا مشکل نہیں ہے، مگر گاؤں سے بیکار بُرائی لینی پڑے گی۔ آج تک بھل منساہٹ

سے دن کاٹے ہیں، کسی سے ایک بات بھی نہیں سُنی۔"

آبیو کو بھی میری بات پسند آئی۔ اُسے ذرا سا بھی سمجھا دو تو سمجھ جاتا تھا۔ کم از کم چہرے سے تو یہی ظاہر کرتا تھا کہ بات اُسے جچ گئی ہے اور منہ سے بھی کہہ دیتا تھا۔

"ماسٹر جی! آج اس نے آپ کو کیا تکلیف پہنچائی؟"

"وہ اِدھر اُدھر کی چغلی کھانے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے۔ مُکھیا مجھ سے بات نہیں کرتا تھا، یہ سب چُغل خور ہی کا کام تھا۔"

"میں نے آپ سے پہلے ہی یہ کہا تھا۔"

"کہتے ہیں کہ اس نے بوڑھے سے کہہ دیا تھا کہ ماسٹر کے اور انجی کے تعلقات خراب ہیں۔" اس ناگہانی خبر کی وجہ سے آبیو کے منہ سے ایک بڑی بھاری گالی نکل گئی۔ چغل خور نے جھوٹ موٹ کچھ اور کہہ دیا ہوگا، مگر ماسٹر اور انجی کے تعلقات کے باب میں مکھیا سے ذکر کرنے کا آبیو کو بڑا اچنبھا ہوا اور اس کے ساتھ ہی غصہ بھی آیا۔ اس نے کہا "مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ چغل خور اتنی دور تک جائے گا۔"

میں نے کہا "گاؤں بھر میں کوئی شخص میرا بُرا نہیں چاہتا، لیکن یہ چغل خور البتہ شروع ہی سے سانپ کی طرح مجھے ڈسنا چاہتا ہے۔ کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا۔ سامنے آکر مجھ سے مقابلہ کرنا بھی نہیں چاہتا، آڑ سے گولیاں چلاتا ہے۔"

باتیں کرتے کرتے مجھے یاد آیا کہ جب میں یہاں آیا ہی تھا تو اس پاجی نے اس کمرے میں آکر مجھ پر بڑی دھونس جمائی تھی۔ اب انجی کے معاملے کو لے کر گاؤں میں آگ لگا کر یہ آدمی کبھی نہ کبھی مجھے پٹوائے گا، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ اُدھر آبیو خرّاٹے لے رہا تھا۔

اس کے تیسرے چوتھے دن میں چوپال کے سامنے کافی دیر تک بیٹھ کر لوٹا۔ دروازہ کھولا تو آبیو سو رہا تھا۔ دیا سلائی جلا کر میں نے بستر دیکھا اور لیٹ کر سو گیا۔

ابھی پہلی نیند بھی نہ ہو پائی تھی کہ کسی شور کی وجہ سے جاگ اٹھا۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا پھر ایسا لگا کہ بڑاڑ کی طرف کچھ شور ہو رہا ہے۔ میں اندھیرے میں بیٹھ کر کان لگا کر سننے لگا۔ سوائے شور کے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بھیڑیا آیا ہوگا، یا کہیں سانپ نکلا ہوگا۔ میں نے آبیو کو آواز دی "آبیو! آبیو! یہ شور کیسا ہے!"

آبو نہیں جاگا۔ میں نے اندھیرے میں اسے ہلا کر جگایا وہ بھونچکا ہو کر اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا،
"کیا ہے؟ کون ہے؟"
پھر وہ کچھ ہوش میں آیا تو میں نے پوچھا
"تجھے شور سنائی دے رہا ہے، پڑاؤ کے سامنے لوگ جمع ہیں"
اس نے بھی کان لگا کر سنا۔
"پڑاؤ کے سامنے کچھ ہنگامہ ہو تو رہا ہے۔ جا کر دیکھ آؤں؟"
میں نے کہا "چل، میں بھی چلتا ہوں"
ہم دونوں باہر نکلے، گھپ اندھیرا تھا جس میں سے ہم حسب عادت تیزی سے گزرے۔ پڑاؤ کے پاس پہنچے۔ جو آدمی پہلے نظر آیا اس سے میں نے پوچھا "کیا ہوا ہے؟ یہ ہنگامہ کیسا ہے؟"
اس نے کہا "دادو چغل خور کی کسی نے جی بھر کے پٹائی کر دی ہے"
"کس نے؟ کون تھا؟"
"وہ اندھیرے میں نظر نہیں آیا"
بھیڑ میں گھس کر میں آگے بڑھا۔ دادو کی بڑھیا دیا لے کر بیٹھی تھی اور چلا چلا کر کہہ رہی تھی کہ "اری ماں اب کیا کروں!" اور دادو دھول میں اوندھا پڑا تھا۔ اس کا صافہ گر کر الگ جا پڑا تھا، انگرکھا پھٹ گیا تھا۔ چغل خور بے حساب پٹے ہوئے کتے کی طرح زبان نکال کر ہانپ رہا تھا۔ مکھیا، راما گڈریا پیروں کے بل بیٹھے تھے اور لگاتار کہے جا رہے تھے
"ارے دادو! ذرا اٹھ کر بیٹھ تو سہی! کیا ہوا، کس نے مارا؟"
اور چغل خور آنکھیں بند کر کے صرف گردن ہلا رہا تھا۔ وہ نہ اٹھ سکتا تھا، نہ بیٹھ سکتا تھا۔
میں نے کہا "اسے یوں دھول میں آپ لوگوں نے کیوں پٹک رکھا ہے، اٹھا کر گھر میں لے جاؤ"
سب نے میری ہاں میں ہاں ملائی لیکن آگے بڑھ کر اسے کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔ پھر آنندا راموشی آیا اور اس نے اسے اس طرح اٹھایا جس طرح مرے ہوئے بکرے کو اور اسے اٹھا کر گھر کی طرف لے چلا۔
پندرہ بیس آدمیوں کی ٹولی کھانستی کھنکھارتی اور ایک دوسرے سے "کیا ہوا، کیا ہوا؟" پوچھتی ہوئی اس کے پیچھے ہو لی۔
دادو کے گھر پہنچتے ہی کمبل بچھا کر اس کو اس پر لٹا دیا۔ اس کی بڑھیا رو دھو رہی تھی۔ اس پر

مکھیا ناراض ہو کر بولا "سندرا! تو چپ ہو جا! کچھ سمجھتی بھی ہے کہ نہیں؟ کیوں آنسو بہا رہی ہے؟ کیا وہ مر گیا ہے؟
گھر کے اندر باہر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ منہ پر پانی چھڑک کر پنکھا جھلا گیا تو دادو کا ہانپنا ذرا کم ہوا۔ آنکھیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔
میں نے کہا "مجھے پہچانا"
اس نے کچھ کہے بغیر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اس کے منہ کے پاس منہ لے جا کر مکھیا نے کہا "دادو کیا تجھے ہوش ہے، میں کون ہوں؟"
اس پر دادو نے تھوک نگل کر بوڑھے کا ہاتھ کس کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔
"ڈرمت! تجھے کچھ نہیں ہوگا" یہ کہہ کر بوڑھا اس کے ہاتھ پیر ملنے لگا۔ کسی نے کہا "مر گیا، مر گیا! مجھے مار ڈالا رے" کہہ کر چلایا تھا۔ تب میں بھاگ کر باہر آیا۔ اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو کوئی شخص نیچے پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کون ہے رے؟ تو یہ بولا میں دادو۔ مجھے مارا ہے"
راما بولا "ارے کس نے مارا ہے، کیوں مارا اور کس سے مارا؟"
کہنے والا بولا "بھگوان نے دیکھا ہوگا، بعد میں وہ بولا ہی نہیں تو پتہ کیسے چلے۔"
"تو نے کسی کو بھاگتے ہوئے اور چھپتے ہوئے نہیں دیکھا؟"
"جی نہیں، مجھے اپنی ماں کی قسم۔ جھوٹ کیوں بولوں"
"پھر یہ کون بتائے کہ کس نے مارا ہے؟"
باہر سے کوئی بولا "ہو نہ ہو یہ تو بھان متی کا ٹونا ہے۔"
"تو بھائی پٹیل کی وادی میں جاؤ اور منتر پڑھنے والے مہار کو بلاؤ۔ کہتے ہیں کہ اس کے منتر میں بڑا اثر ہے۔"
کوئی شخص جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ تُو۔ تُو۔ مَیں۔ مَیں۔ شروع ہو گئی۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔ بلند آواز سے میں نے کہا "بھان متی، وان متی کچھ نہیں ہے۔ اسے تھوڑا دم لینے اور اٹھ کر بیٹھنے دو تو سب معلوم ہو جائے گا۔"
لیکن مرغ نے صبح کی اذان دے دی تب بھی دادو اٹھ کر نہیں بیٹھ سکا۔ آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹ گئی۔ لوگ چلے گئے۔ میں، آبو، مکھیا، راما اور گاؤں کے دو چار آدمی اور بیٹھے رہے۔ پوچھنے

کے وقت دادو نے اچھی طرح آنکھیں کھولیں اور پانی مانگا۔ گرم چائے بنا کر پلائی گئی جب کہیں اس میں کچھ سکت آئی۔

راما نے پوچھا "دادو کیا اب تم ٹھیک ہو؟"

چغل خور مدھم آواز میں بولا "ہاں"

"تجھے مارا کس نے؟"

دم لے کر دادو نے کہا "مارنے والا مجھے نظر نہیں آیا۔"

"کتنے آدمی تھے؟"

"کچھ پتہ نہیں چلا، اندھیرے میں یکایک جسم پر کمبل ڈال دیا اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور لاٹھیاں چلا دیں۔ ارے راما انھوں نے مجھے جانور کی طرح مارا۔"

"تجھے کسی پر شک ہے؟"

چغل خور نے بڑے تکبّر سے گردن ہلائی اور میری طرف دیکھا۔ پَو پھٹی، دھوپ چڑھی۔ مکھیا اس سے یہ کہہ کر اٹھا "اچھا آرام کر"۔ ہم بھی اٹھے اور باہر آگئے۔

راما بولا "اس بھڑوے کی ہزاروں حرکتیں ہیں۔ کسی دوسرے گاؤں کے آدمیوں نے مارا ہو تو کیا پتہ چلے گا۔

آبو نے کہا "وہ بتا نہیں رہا لیکن اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ مارنے والا کون ہے۔"

مکھیا بولا "ضرور معلوم ہوگا۔ چور کی راہ چور ہی جانتا ہے۔ غنیمت ہے کہ صرف پیٹ پاٹ کر ہی چھوڑ دیا اگر جان لے لیتا تو ہم لوگ کیا کرتے؟"

گھر آتے ہی میں نے آبو سے کہا "آبو، دادو کی مجھ سے بنتی نہیں، اگر وہ کل مجھ پر ہی شک کرنے لگے تو؟"

آبو نے بُرا بھلا کہہ کر کہا "وہ ہجڑا کیا کرے گا۔ اس کا انتظام ہو چکا ہے۔ اب وہ چھ مہینے کمبل نہیں چھوڑ سکے گا۔"

اور ہوا بھی یہی۔ دس پندرہ دن بیت گئے پھر بھی چغل خور چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوا اور ایسے آثار بھی نظر نہیں آئے کہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ دن بھر بستر پر پڑے پڑے کراہتا رہتا۔ کوئی جاتا تو بات تک نہیں کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر سارا گاؤں کہنے لگا۔ 'چغل خور کو بھوت نے کچل دیا ہے اب وہ بھوت سے بچ کر زندہ نہیں رہے گا۔'

(۱۴)

ایک بار میرے من میں خیال آیا کہ اس چھوٹے سے گاوں میں ایک مضبوط پکی عمارت ہو جو گاؤں کے خرچ ہی سے بننی چاہیے۔ کیا اس قسم کا خرچ کرنے کے لیے یہ پاگل گڈریے رضامند ہو جائیں گے؟ وہاں ایک کہاوت تھی "گڈریے کا پاگل پن چھ مہینے نہیں جاتا"۔ یہ کہاوت گڈریوں کی اڑیل طبیعت کی وجہ سے بنی ہوگی۔ یہ بات ان گڈریوں کو درست نہیں معلوم ہوتی تھی کہ گاؤں میں ایک اچھی عمارت ہونا چاہیے۔ اگر پاٹھ شالا کی عمارت بنائی جائے تو اس کے لیے جگہ تو تھی اور نہ ایسے آثار مستقبل قریب میں نظر آتے تھے کہ یہ جگہ ناکافی ہوگی پھر عمارت کی کیا ضرورت تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اکھاڑا بنائیں بچوں کے لیے کھیلنے اور گاؤں والوں کے واسطے ایک جگہ بیٹھنے کے لیے اکھاڑے کی لمبی چوڑی عمارت بنائیں۔ ریاست کے راجہ صاحب کو کسرت کا شوق تھا اس وجہ سے محکمۂ تعلیم یا راجہ کے صرفِ خاص سے کچھ امداد مل جانے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس گاؤں کی پاٹھ شالا کا میں ماسٹر تھا اس طرح یہ بھی لوگوں کو یاد رہے گا۔

رات کو میں نے راموشی کو گھر گھر بھیجا اور سارا گاؤں اکٹھا کر لیا۔ روٹی کھا کر ڈاڑھ میں تمباکو دبائے لوگ کمبل اوڑھ کر آئے اور پاٹھ شالا کے سامنے والے میدان میں بیٹھ گئے۔ میں چبوترے پر تھا میرے سامنے مکھیا تھا، راما گڈریا تھا اور شیکو تھا۔ کاکوا بھی تھا۔ کھیتوں میں کیوں کہ کوئی کام دھام نہیں تھا اسی لیے یہ سب میرے کہنے پر آ گئے تھے۔

شروعات اِدھر اُدھر کی پوچھ تاچھ سے ہوئی۔ اسی وقت پتہ چلا کہ دادوا اب بھی ہِل نہیں سکتا سارے بدن میں مسلسل درد رہتا ہے۔ کسی نے اُسے فوجداری عدالت میں جانے کی بات سمجھائی تو اُس نے کہا تھا کہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں اور مارنے والے مل بھی جائیں مگر اس سے میری پٹائی کا بدلہ کیسے ملے گا.... بات سچ ہی تھی۔

پھر میں نے اصل مدعا بیان کیا اور کہا "میری ایسی خواہش ہے کہ گاؤں میں ایک اچھی عمارت ہو جو ہماری جھونپڑیوں اور گھروں سے مضبوط ہو۔ ہم روز یہاں دھول میں بیٹھتے ہیں۔ بارش یا زیادہ سردی ہو تو کوئی یہاں نہیں آتا۔ پاٹھ شالا کا کوئی افسر، تھانیدار یا سپاہی آئے تو اُسے ٹھہرنے کی پریشانی ہوتی ہے۔ بھنگی چماروں کی بستی میں بھی پکی اور آرام دہ عمارت ہوتی ہے تو پھر اپنے ہی گاؤں میں کیوں نہ ہو۔ اس لیے میرے من میں یہ بات آئی ہے کہ گاؤں میں ایک اکھاڑا بنایا جائے۔ آپ کی کیا

رائے ہے ؟ " لوگوں میں کانا پھوسی ہوئی۔ انھیں ایسا لگا کہ ماسٹر کے سر پر کوئی پاگل پن سوار ہو گیا ہے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اس پر میں نے زور سے کہا " آپ لوگ آپس میں باتیں نہ کیجیے۔ اگر مجھے گدھا بھی کہنا ہو تو کہیے اور صاف صاف کہیے اور مجھ سے کہیے۔"

بالا گڈریا چبا چبا کر بولا " گاؤں میں پہلوان کہاں ہیں جو اکھاڑا بنائیں؛"

" آپ نے پاٹھ شالا شروع کرتے وقت بھی کہا تھا کہ گاؤں میں بچّے کہاں ہیں، مگر اب بچّے آتے ہیں نا— ! کل دس پانچ بچّے تحصیل کے اسکول میں جائیں گے۔ انھوں نے ساتویں جماعت پاس کر لی ہے۔"

کسی نے کہا " کیسے جائیں گے ؟ ذرا بڑے ہوتے ہی بھیڑوں کے ساتھ جائیں گے۔ ساتویں جماعت پاس کرتے ہی آپ کی طرح ماسٹر تھوڑا ہی ہو جائیں گے۔ کیا ہمارے جیسا کوئی بھی پڑھ لکھ کر تحصیل میں افسر بنا ہے ؟"

بوڑھا مکھیا ان کو سمجھاتے ہوئے بولا " اگر آج پاٹھ شالا نہ ہو تو بھی بچے کھیلنے لگیں گے اور کھیلتے کھیلتے ان میں سے ایک آدھ پہلوان ہو ہی جائے گا۔"

میں نے کہا " مان لیجیے کوئی نہ بھی ہوا تو کیا گاؤں کو عمارت کا فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ گجی ناچتے ہیں اس کا سامان دس جگہ بکھرا رہتا ہے، ڈھول ایک جگہ، کھرتال دوسری جگہ۔ لیزم، لاٹھی پٹہ، کوئی نہ کوئی کھیلتا ہی ہے۔ وہ سارا سامان اکھاڑے میں رہے اور جس کو یہ کھیل اچھی طرح آتے ہوں وہ فرصت کے وقت بچوں کو کچھ ہاتھ سکھائیں تو کیا کوئی بے جا بات ہوگی ؟"

" لیکن اکھاڑہ بنانے کے لیے جو ڈھیروں روپیہ لگے گا وہ کون دے گا ؟"

" گاؤں چندہ دے۔ ہر گھر دس بیس روپے دے سکے گا۔"

" ہوں ! ہیں کس کے پاس۔"

" مجھے معلوم ہے۔ بہتوں کے پاس ہیں۔ جن کے پاس نہیں ہوں گے وہ محنت سے چکا سکیں گے۔ گاڑی بیل دیں، اپنے کھیت کے پیڑ دیں۔ اگر ساری واڑی طے کرے تو دس منزل کی ایک عمارت بات ہی بات میں بن جائے گی۔"

میں نے کہہ تو دیا لیکن میری بات کسی کو جچی نہیں اور کھلی مخالفت بھی کوئی کر نہیں پایا۔ عمارت آدھی ہی رہ گئی تو بے کار ہنسی اُڑے گی۔ زیادہ تر لوگ یہی کہہ رہے تھے لیکن میں چپ نہیں بیٹھا۔ الگ الگ طریقوں سے میں یہ بات ان سے کہتا رہا۔

گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو میں نے دوبارہ اکٹھا کیا اور ان سے مشورہ کیا۔ کئی گاؤں والوں نے پاٹھ شالائیں کیسے بنوائیں، سرکار نے کیسے ان کی تعریف کی۔ ان گاووں کی کتنی زیادہ شہرت ہوئی میں نے انھیں یہ سب کچھ بتایا اور ان سے ہاں کروالی۔

جب یہ لوگ تیار ہو گئے تو گاؤں کا گاؤں از خود تیار ہو گیا۔ ایک نے کہا کہ یہ کام کر ڈالیں تو سب نے کہا چلو کر ہی ڈالیں۔ ہر ایک گھر نے دس روپے چندہ دینا منظور کر لیا۔ جن کے پاس بیل یا گاڑیاں تھیں انھوں نے محنت کرنا منظور کر لیا۔ آنے والے چھ مہینوں کے اندر اندر عمارت تیار کر دینا ہے اور راجہ صاحب کو بلا کر ان کے ہاتھ سے افتتاح کروانا۔ یہ سب باتیں طے ہو گئیں۔ ماسٹر کی ہمت اور گاؤں کے اتفاق کی وجہ سے جو راجہ آج تک کبھی نہیں آیا تھا وہ گڈریوں کے اس گاؤں میں آئے گا۔ لوگوں میں اس تصور ہی سے بڑا حوصلہ پیدا ہو گیا۔ یہ بات گھر گھر میں پھیل گئی کہ اپنے گاؤں میں اکھاڑا بنے گا اور راجہ صاحب آئیں گے۔ ایسی بات جس کا ذکر کئی دن تک ہوتا رہے ابھی تک یہاں نہیں ہوئی تھی مگر اب جلد ہی ہونے والی تھی۔ لوگوں نے فوراً ہی اپنا چندہ بوڑھے مکھیا کے پاس جمع کرا دیا میں نے امداد کے لیے سرکار کو درخواست بھیج دی۔ معمار اور بڑھئی وغیرہ کی تلاش کا کام شروع ہو گیا کیوں کہ ایسے کاری گر واڑی میں نہیں تھے۔ انھیں منھ مانگی مزدوری دے دلا کر لایا جائے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لکڑی کی ضرورت تھی اور یہ بات بھی طے تھی کہ دور پہاڑ سے پتھر لانے پڑیں گے۔ پہلے تو مزدوروں کو طے کرو پھر وہ وہاں پتھر توڑیں گے۔ گاڑیاں جوت کر خود ہی گاؤں میں لاؤ۔ اس کے بعد معمار آئیں گے اور پتھر گھڑیں گے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ "گھر بناؤ تو جانو!" یہ کوئی جھوٹ بات نہیں ہے۔ دیہات میں عام چیزوں کی وجہ سے بھی کام رُک جاتا ہے اور یہ نہ پوچھیے کہ معمولی سی وجہ سے کام میں کتنی تاخیر ہو سکتی ہے۔

جب ساری تیاری شروع ہو گئی تو خیال آیا کہ جگہ کا انتخاب کر لیں۔ میرا خیال تھا کہ جگہ کہیں نہ کہیں مل جائے گی لیکن جب دیکھنے نکلا تو اکھاڑے کے لائق کوئی جگہ نظر نہیں آئی۔ گاؤں میں ہی اور وہ بھی سب کے لیے موزوں ایک جگہ مجھے دکھائی دی لیکن اس جگہ چار منزل کا ایک گرا ہوا گھر تھا اور اس گھر پہ تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اپنے من میں وہ جگہ طے کر لی اور رات کو جب لوگ جمع ہوئے تو ان کو بتائی۔

مکھیا بولا "لیکن وہ گھر تو کسی اور کی ملکیت ہے۔"

"کس کی؟"

"ایک دوسرے گاؤں کا بنیا آیا تھا اور یہاں رہتا تھا۔ اس نے یہ گھر بنایا تھا۔"

"اب وہ کہاں ہے؟ ہم یہ جگہ اس سے خرید لیں گے۔"

لوگ میری اس بات پر ہنسے۔ کسی نے وضاحت کی "بنیا تو مر چکا۔ چائے بیڑی کی وجہ سے اس کے خاندان میں بھی تفرقہ پڑ گیا۔

تب مجھے اس جگہ کے مالک کی حقیقت لوگوں نے سُنائی۔ واقعی سدّیا بنیا چائے بیڑی ہی کی وجہ سے مَرا تھا۔ شراب کی وجہ سے یا عورت کے جھگڑے میں یا جوئے کی وجہ سے گھر بار برباد ہونے کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن چائے بیڑی جیسے معمولی شوق میں سدّیا بنیا کیسے مر گیا؟ ملیا میٹ کیسے ہو گیا؟ کہتے ہیں کہ وہ کھانا تو کھاتا ہی نہیں تھا۔ لگاتار تیز چائے بنا کر پیا کرتا اور بیڑی پیتا رہتا تھا۔ گھر میں اس کی بوڑھی ماں تھی اس نے بہت روکا لیکن بیٹے نے نہیں سُنا۔ کچھ بھی کام کاج نہیں کرتا تھا۔ گھنٹے گھنٹے کے بعد چائے پیتا اور ہر پانچ منٹ کے بعد بیڑی۔ یہ بھی اگر تنہا ہی کرتا تو مضائقہ نہیں نہیں تھا۔ آس پاس کے لوگوں کو بصند بُلا لاتا۔ دس بیس لوگ جمع ہو جاتے تو ہنڈیا بھر کے چائے بناتا اور لوگوں کو پینے پر مجبور کرتا۔ بیڑیوں کے بنڈل ان کے سامنے پھینک دیتا۔ لوگوں کا کیا جاتا تھا۔ مفت میں زہر بھی ملے تو پی جائیں۔ سدّیا بلاتا اور لوگ جاتے۔ چائے پی کر اور بیڑی پھونک کر پیٹھ پیچھے کہتے "بالکل بے وقوف ہے۔ اس طرح بھکاری ہو جائے گا۔"

لیکن سدّیا کو یہ سب کچھ بُرا نہیں لگتا تھا۔ وہ تو داں ویر بن بیٹھا تھا۔ کئی سال تک یہی طور طریقہ جاری رہا۔ آہستہ آہستہ اپنی اور باپ دادا کی پونجی ختم ہو گئی۔ پھر سدّیا نے گھر میں بندھی ہوئی گائیں بیچیں۔ زمین کا ٹکڑا فروخت کیا۔ آخر کار جو کچھ اس کے پاس تھا اُسے بیچ باچ کر چائے پینا شروع کی اور ایک دن اس کے پاس بیچنے کے لیے بھی کچھ نہ رہا۔ پہلے بڑا اچھا اکھاڑے باز اور تنومند آدمی تھا لیکن بعد میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ چھاتی دھوئیں سے چھلنی ہو گئی۔ چائے کے اثر سے بھوک مر گئی۔ کھانسی اور دمے میں مبتلا ہو گیا۔ بڑھیا بھی مر گئی۔ صرف اکیلا سدّیا بچ رہا۔ محنت کر کے کچھ کھانے کی طاقت اس میں رہی ہی نہ تھی۔ گھر کے اندر یوں ہی بیٹھا رہتا اور آنے جانے والے کو پکار کر اس سے بیڑی مانگ لیتا۔ گاؤں کی عورتیں رحم کھا کر اسے کبھی کبھی گڑ کی چائے پلا دیتیں۔ کچھ دن اس حالت میں وہ جیتا رہا۔ آخر ایک دن خارش زدہ کتّے کی طرح ختم ہو گیا۔

سدّیا کی یہ عجیب کہانی سننے کے بعد میں نے کہا "مطلب یہ ہے کہ اب اس جگہ کا وارث کوئی نہیں رہا۔ گاؤں اگر اسے اکھاڑے کے لیے لے تو حرج کی کوئی بات نہیں۔"

لیکن اس بات کے لیے کوئی تیار نہیں ہو رہا تھا۔ بنیے کی جگہ کیسے لے لیں۔ ہر شخص خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔ میں نے بار بار کہا کہ اس جگہ کو گرا کر صاف کرنے کے بعد لائنیں لگانے میں سہولت ہو گی لیکن اس پر کسی نے بھی دھیان نہیں دیا۔ پھر میں ہی ایک دن اسکول کے بچوں کو ساتھ لے گیا اور گھر کی ڈھئی ہوئی دیواروں کو کھودنا شروع کر دیا۔ بندر سینا (بچوں کی فوج) کام میں لگ گئی۔ کدال اور پھاوڑے لے کر لڑکے بالے بنیے کا گرا ہوا گھر صاف کرنے لگے۔ ہاتھ میں کدال لے کر ماسٹر نے گھر کو گرانا ہی شروع کیا تھا کہ گاؤں کے لوگ بھی آ گئے۔ پہلی کدال چلانے کی وجہ سے سارا پاپ میرے ہی سر پر تھوپا گیا تھا۔ اصل پاپی میں ہی تھا۔ اب دوسروں کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ گاؤں کے لوگ کافی اکٹھا ہو گئے اور دیکھتے دیکھتے گھر صاف ہو گیا۔ چار پانچ دن گزر گئے۔ جس جگہ بنیے کا گھر تھا وہاں اب اس کا نشان تک نہیں تھا۔

پھر پیڑ اکٹھے کرنے کا مہورت ہوا۔ گاؤں کے دو چار ذمّہ دار لوگوں کو ساتھ لے کر میں کھیتوں اور باغیچوں میں گیا۔ جس کے کھیت میں عمارت کے قابل نیم کا پیڑ تھا انھوں نے بڑی تو تو میں میں کے بعد وہ پیڑ دینا شروع کیے۔ کئی بار مالک ایسے پیڑ دکھاتا جو اچھے نہیں تھے اور اندر سے کھوکھلے تھے، اس پر اس سے بحث کرنی پڑتی تو کبھی کبھی جی جل جاتا تھا۔

میں اپنے گھر کے لیے تو لکڑی مانگ نہیں رہا تھا پھر بھی لوگ پیڑ دینے سے کتراتے تھے یہ بات نہیں کہ سب کے سب بخیل ہی تھے۔ خوشی سے دینے والے بھی ملے لیکن پریشانی ضرور ہوئی۔ پیڑ مل جانے کے بعد آدمیوں کو لے جا کر اُسے گرانا، توڑنا، کسی سے گاڑی لینا اور کسی سے بَیل۔ ڈھو کر لکڑی کو پاٹھ شالا کے پاس لانا اور بڑھئی کے حوالے کرنا، یہ سب سلسلہ جاری ہو گیا۔ وقت پر آدمی نہیں ملتے تھے، گاڑی بیل نہیں ملتے تھے۔ اس کے لیے کبھی جھلّانا، کبھی خوشامد کرنا اور کبھی دھونس دینا۔ یہ سب کچھ کرنا پڑتا تھا اور جب یہ باتیں حد سے زیادہ بڑھ جاتیں تو میں مکھیا سے کہتا "بابا رہنے دو! بہت ہو گیا اکھاڑہ۔ میں چھٹی لے کر چلا جاتا ہوں، آپ خود ہی اکھاڑا بنائیے یا نہ بنائیے آپ میں سے کسی کو بھی ضرورت نہیں ہے تو میں کیوں اپنی جان کو دُکھ دوں۔"

مکھیا مجھے سمجھاتا "بچے، تیرے جانے کے بعد عمارت کیسی؟ جو اتنی دوڑ دھوپ کی اس پر بھی پانی پھر جائے گا۔ لکڑی گل جائے گی۔ جو پتھر لائے ہیں انھیں لوگ اٹھا کر لے جائیں گے۔ اسے عمارت بنانا آسان نہیں ہوتا۔ تکلیف تو ہو گی ہی۔ جو دس آدمیوں کا کام ہو تو اس میں بھنگی کا کام تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اب جو شروع سے ہی منظور کر لیا تو اسے کنارے لگانا ہی ہو گا۔"

لیکن میں بھی کہاں اس کو ادھورا چھوڑنے والا تھا۔ انکار ممکن ہی نہیں تھا۔ اکھاڑے کی عمارت تو اب میری اپنی کامیابی اور ناکامیابی کا معاملہ بن گئی تھی بلکہ یوں کہیے کہ بنگرواڈی کی آبرو کا معاملہ تھا۔ آس پاس کے چھوٹے گاؤں اس واڈی کو حیرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ بھیڑیں چرانے والے ان ناسمجھ گڈریوں سے ایسا کام کیسے ہو سکے گا۔ ماسٹر بڑا حوصلہ مند آدمی ہے، مگر صرف حوصلے سے کیا ہوگا۔ وہ کچھ اس طرح کی باتیں کرتے تھے۔ انھیں یہ بات کر کے دکھانی تھی۔ کہ آس پاس کے پانچ دس گاؤں میں ایسا اچھا کوئی اکھاڑا نہیں ہے جو بنگرواڈی میں بننے والا تھا۔
پیڑ اکٹھے کرنے کی مہم کے دوران میں ایک بار بالا گڈریے کے کھیت میں جا پہنچا۔ آبو اور آنندا بھی ساتھ تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ بالا کے کھیت کا ایک پیڑ ہمیں ضرور چاہیے تھا۔ اُسے شہتیر کے لیے استعمال کرنا تھا۔ آنندا نے راہ میں ہی ببول پر بیٹھے ہوئے ہولے کو غلیل سے مار دیا۔ وہ تڑپ ہی رہا تھا کہ آبو نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔ ہولے نے گردن نیچے لٹکا دی۔ پھر آنندا درختوں کی ٹوہ لینے لگا اور آبو چلتے چلتے اس مری ہوئی چڑیا کے پر نکالنے لگا۔

میں اکیلا ہی ان سے آگے بڑھ گیا۔ ڈھلتی دوپہر کے چار ساڑھے چار کا وقت ہوگا۔ میں کھیت میں پہنچا تو بالا مویشی باندھنے کے لیے ایک پرانی رسی بٹ رہا تھا اور نیم کی چھاؤں میں بیٹھا تھا۔ ایک دھوتی کے سوا اور کچھ اس کے بدن پر نہیں تھا۔ چھوٹی پیشانی، چوڑی ناک اور چھوٹی تھوڑی والا بالا محویت کے عالم میں بیٹھا مویشیوں کو باندھنے کی رسیوں کی مرمت کر رہا تھا۔

وہ سمجھ گیا کہ میں کیوں آیا ہوں۔ اس نے میری کوئی آؤ بھگت نہیں کی۔ بیٹھ جانے تک کے لیے نہیں کہا۔ کچھ نہ کچھ کہنے کی خاطر اس نے کہا "ماسٹر صاحب! کدھر کا دھاوا ہے؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "آج تو دانستہ آپ ہی کے پاس آیا ہوں" اور زمین صاف کر کے بیٹھ گیا۔

بالا اس سے زیادہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے ہی ہمت کر کے کہا "تم اکھاڑے کے لیے پیڑ کب دے رہے ہو؟"

"کونسا پیڑ؟"

اب تک مجھے ایسا جواب سُننے کی عادت ہو گئی تھی۔ پھر بھی دل تو دکھا ہی اور چہرے پر اس کے آثار بھی نظر آئے ہوں گے لیکن میں نے نیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہی پیڑ اور کون سا؟ یہ جس کے سائے میں ہم بیٹھے ہیں یہی دے دیجیے۔"

بالا گردن ہلا کر بولا " یہ نہیں ملے گا۔"
"کیوں ؟"
"میری مرضی!"
"ایسا کہنے سے تو کام نہیں چلے گا۔"
" دیکھوں گا کیسے نہیں چلے گا۔ جس کی کلائی میں طاقت ہو گی وہی اس پیڑ کو گرا کر لے جا سکے گا۔"
"زبردستی لے جانے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تو رضامندی کا معاملہ ہے۔"
" تو میری مرضی تو نہیں ہے۔ نہ مجھے گاؤں چاہیے اور نہ اکھاڑا۔ میرے کھیت میں سائے کے لیے یہی ایک پیڑ ہے۔ میرے مویشی، بال بچے گھڑی دو گھڑی اس کے سائے میں بیٹھتے ہیں اور آپ اسی کو لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نہیں دوں گا۔ پیڑ پر کلہاڑی چلانے سے پہلے میری گردن کاٹیے اور پھر آرام سے لے جائیے۔"
" اچھی بات ہے۔"
اتنا کہہ کر میں اٹھا اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔ راستے میں آبو اور آنندا ملے۔
" ماسٹر جی کیا بالا سے پیڑ مل گیا ؟"
میں نے جواب دیا "نہیں، وہ کہتا ہے کلہاڑی پہلے میری گردن پر چلاؤ پھر پیڑ پر۔"
اس کے بعد مکھیا، راما اور دو چار آدمی مل کر بالا کے پاس گئے۔ اس وقت بھی وہ مویشی باندھنے کی ٹوٹی ہوئی رسی بٹتے ہوئے نیم کی چھاؤں میں بیٹھا تھا۔ اس کی بکریاں اِدھر اُدھر بیٹھی کان ہلا رہی تھیں۔ بیوی بچے بیٹھے تھے۔ اسی نیم کے سائے میں اس نے اپنے دونوں بیل باندھ رکھے تھے۔ اس کا کتا بھی جسم کو دہرا کر کے بیٹھا تھا۔ ہمارے جاتے ہی بالا کلہاڑی لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ یہ بے وقوف آدمی کہیں سیدھا مار پیٹ پر تو نہیں اُتر آئے گا۔ کچھ اس طرح کے شک سے میرے پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ وہ کلہاڑی لیے ہوئے ہماری طرف آیا۔ اسے اس طرح آتا ہوا دیکھ کر مکھیا آگے بڑھا اور کسی کا پیر اپنی جگہ سے نہیں ہلا لیکن جب ڈھلتی ہوئی عمر کا مکھیا آگے بڑھا تو بالا نے اپنی کلہاڑی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا " کل ماسٹر سے کہا تھا پیڑ کاٹنے سے پہلے میری گردن کاٹ دو! اب آپ سے کہتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ بڑھا اور نیم کے نیچے بیٹھے ہوئے اپنے کنبے کی طرف انگلی کر کے بولے " ان سب کی اور اتنے جانوروں کی گردنیں کاٹیے اور پھر پیڑ بھی کاٹ لیجیے۔"
اس کا ہاتھ پکڑ کر مکھیا اسے سائے میں لے گیا، نیچے بٹھایا اور کہا " بچے، بس خاموش ہو کر

بیٹھا رہ اور میری بات سُن۔"

مکھیا کا ہاتھ جھٹک کر بالا اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ مٹکاتے ہوئے بولا" میں کسی کی نہیں سنوں گا آپ لوگ مجھے مٹی میں ملادیں گے۔ میں اکھاڑے کی کوئی مدد نہیں کروں گا۔ پیڑ نہیں دوں گا۔ جو ہونا ہوگا سو ہو جائے۔"

مکھیا اب بھی پُرسکون تھا" بیٹے تو بیکار آفت نہ مچا۔ گاؤں کے لیے ایک پیڑ دے دینے سے تیرا گھر ڈوب نہیں جائے گا۔"

" ڈوبے نہ ڈوبے لیکن میں پیڑ نہیں دوں گا۔"

" کیا یہ بات پختہ ہے ؟"

" ہاں۔ پختہ۔ پنت سرکار بھی آجائے تو پیڑ نہیں دوں گا۔ انگریز صاحب آجائے تو بھی نہیں دوں گا۔ مجھے کون پھانسی پر چڑھادے گا دیکھوں تو سہی۔"

اتنا سن لینے کے بعد بوڑھا مکھیا لوٹ آیا اور ہاتھ کا اشارا کر کے بولا" چلو، واپس چلو۔"

بالا کی ضد سے سبھی گرم ہو گئے۔ اس کے کھیت میں سایے کے لیے صرف یہی پیڑ تھا، یہ بات اتنی صحیح نہ تھی۔ مینڈ پر نیم کے چھوٹے چھوٹے پیڑ تھے۔ ایسی بات نہیں تھی کہ اُسے بالکل دھوپ میں ہی بیٹھنا پڑتا۔

مکھیا نے جب کہا کہ چلو تو راما گڈریا اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ تاؤ میں آکر راما بولا۔" بالا! یہ ٹھیک نہیں ہے تو گاؤں کے خلاف جارہا ہے۔"

بالا چلا کر بولا" مجھے گاؤں اور سماج کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آٹھ سال سے میں اپنی زمین پر رہ رہا ہوں، آیندہ بھی اسی طرح رہوں گا۔ تو مجھے گاؤں کا ڈر کیوں جتارہا ہے۔ ارے راما! بیوہ کو بدنامی کی دھونس کیسی ؟"

یہ سُن کر راما اور آنندا غصّے میں بالا کی طرف لپکے۔ اس پر مکھیا نے انھیں اپنے ڈنڈے سے پیچھے ہٹایا۔ بڑی سخت آواز سے اس نے بالا سے کہا" بالا! جو کہا ہے اُسے اچھی طرح نبھانا۔ گاؤں کے پاس کبھی نہ آنا۔"

اور ایک دوسرے سے کچھ بھی کہے بغیر ہم سب کھیت سے گاؤں میں آگئے۔

گاؤں کے پاس آتے ہی بوڑھا بولا۔" اس بالا سے اب پھر نہ پوچھنا۔ اس کے جانور اپنے کھیتوں سے ہو کر جانے نہ دینا۔ اس کی مشکل اور پریشانی کا خیال نہ کرنا۔ مجھے دیکھنے دو کہ وہ کس

حد تک جاتا ہے۔"

جلدی ہی یہ خبر ساری واڑی میں پھیل گئی۔ بالا گڈریے کا حقہ پانی بند کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر بچے بچے کو معلوم ہو گئی اور اس پر فوراً ہی عمل بھی شروع ہو گیا۔ بالا گڈریے کا بیٹا بجرا کاٹنے کے لیے آیبو کو بلانے آیا تو آیبو نے صاف کہہ دیا "میں نہیں آؤں گا، گاؤں والوں نے تمھارے گھر کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔"

"لیکن تیرا اور گاؤں کا کیا تعلق ہے؟ تو تو باہر کا رہنے والا ہے اور جو کوئی تجھے ٹکڑا دے تو اسی کا کام کر دیتا ہے۔ میں تجھے مفت کام کرنے کے لیے نہیں کہتا۔ سیر سوا سیر جتنا چاہے مانگ لے۔"

"تو یہاں سے چلتا ہو، تیرے سیر سوا سیر کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔"

جب یہ بات بالا کو معلوم ہوئی تو وہ لڑکے پر ہی بگڑا۔ اس نے لڑکے کو چھ کوس دور تحصیل میں بھیجا اور وہاں سے قصائی کو بلوا کر بکرا کٹوایا۔

کوئی شخص اس کے کھیت پر مزدوری لے کر بھی کام کرنے کے لیے واڑی سے نہیں جاتا تھا۔ اس پر زیادہ مزدوری دے کر اس نے دوسرے گاؤں سے مزدور بلوائے۔ اس کے کنوئیں کا پانی کھاری تھا اس لیے اس کی گھر والی واڑی کے کنوئیں سے پانی کے دو برتن بھر کے لے جاتی تھی۔ لوگوں نے اسے بھی روک دیا۔ بالا روزانہ تین میل کا فاصلہ طے کر کے ایک کنوئیں کا میٹھا پانی پینے کے لیے لانے لگا۔ اس نے مویشی دوسرے کے کھیتوں سے لے جانا بند کر دیا۔ اس کے بچے پاٹھ شالا اور گاؤں میں آنے بند ہو گئے۔ بالا گڈریے نے گاؤں کے سامنے جھکنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ اڑیل آدمی اپنی ضد پر اڑا رہا اور واڑی والے اس کا انتظار کرتے رہے کہ وہ کس حد تک برداشت کرے گا

(۱۵)

میرا اندازہ بالکل غلط نکلا۔ جس کام کو بڑے جوش کے ساتھ میں نے ہاتھ میں لیا تھا وہ چیونٹی کی رفتار سے ہو رہا تھا۔ میرا مطلب اکھاڑے کے کام سے ہے۔ اکھاڑے کے لیے ضروری لکڑی اکٹھا کرنے میں بہت وقت لگ گیا۔ پتھر نکالنے والوں نے پتھر نکال تو لیے مگر انھیں گاؤں میں لانے کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ چنائی کے لیے چونے کو تحصیل سے لانا، اُسے گھانی میں پیسنا کیل کانٹے اکٹھے کرنا وغیرہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑا وقت کھا گئیں۔ مجھے کسی طرح کا بھی تجربہ نہیں تھا۔

اس لیے مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وقت ایسے ہی نکلا جارہا ہے۔ میں بار بار کام کرنے والوں کو ڈانٹتا اور پھٹکارتا لیکن واڑی کے لوگوں کے لیے تو یہ باتیں نئی نہیں تھیں۔ عمارت یا کنوئیں کا کام گاؤں میں شروع ہو کر پورا ہو جائے یہ واقعہ ہی بڑا اہم ہوتا ہے۔ حوصلے اور جوش کے ساتھ کیے گئے اس قسم کے کام وقت لے کر بھی کئی بار ادھورے رہ جاتے ہیں۔ گھر بن جاتا ہے تو دروازہ رہ جاتا ہے، کبھی کھونٹیاں رہ جاتی ہیں کبھی چبوترا۔ کنواں پورا ہو جاتا ہے تو ارد گرد کا چبوترا رہ جاتا ہے دو گھرنیوں میں سے ایک ہی چالو ہوتی ہے۔ بنانے والا یہ سوچ کر کہ جتنی ضرورت ہے اتنا کام ہو ہی گیا ہے اور اب کوئی اڑچن نہیں پڑے گی اور باقی ماندہ کام پھر کریں گے، ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ مگر ادھورا کام پھر کبھی پورا نہیں ہوتا۔ ایسے ادھورے کام ہر گاؤں میں کتنے ہی نظر آتے ہیں۔ واڑی کے لوگ یہ سب کچھ جانتے تھے۔ اس لیے کام تیزی سے نہ ہونے کا انھیں کوئی افسوس نہیں تھا۔ وہ اپنا روزانہ کا کام کر چکنے کے بعد اکھاڑے کی طرف توجہ کرتے تھے۔

واڑی کی بیل گاڑیاں ٹوٹ گئیں۔ پتھر ڈھو ڈھو کر شکستہ ہو گئیں۔ معماروں کی ٹھک ٹھک سے گاؤں کے کان بہرے ہو گئے۔ راہوں میں ہر جگہ پتھر کی ٹکڑیاں پھیل گئیں۔ لکڑی کے بُرادے کا ڈھیر لگ گیا۔ چکر کاٹتے کاٹتے اور پھرتے پھرتے آبو کے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ جو بھی کام آپڑتا وہ کرنے سے انکار نہ کرتا تھا۔ محنت کی وجہ سے اس کا جسم بھی کمزور ہو گیا۔ آنندا جو بے حد کام چور تھا وہ بھی کام کرنے لگا۔ اس نے بھی بڑی دوڑ دھوپ کی۔ راما کا بیٹا شکایت لے کر آیا کہ اکھاڑے کے کام میں غرق رہنے کی وجہ سے باپ گھر سے بالکل غافل ہو گیا ہے۔ مکھیا کی کھیتی خراب ہونے لگی۔ اکھاڑے کے کام کی آنچ سبھی تک پہنچ چکی تھی۔ واڑی میں ایک بھی گھر ایسا نہیں رہ گیا تھا جس کا تعلق اس ترقی پسندانہ کام سے نہیں تھا۔

اتنے میں دوسری فصل کا موسم بھی گزر گیا۔ یوں کہیے کہ ایک سال تو چٹکی بجاتے ہی بیت گیا۔ لوگوں کے ہل چلانے کا کام ختم ہو گیا۔ گڈریوں نے بھیڑوں کی اُون اتاری اور ان کی بیویوں نے اُسے دُھن لیا۔ پھر تکلی یا خرچے پر اُسے کاتا۔ سوت کی لچھیاں بازار میں بیچ کر اس سے پیسے بنائے۔ سال بھر کے لیے اپنے واسطے دھوتیاں لیں۔ گڈریوں کے لیے صافے، دھوتیاں اور انگرکھے۔ کسی نے اُون بُننے والوں کو دے کر موٹے موٹے کمبل بُنوا لیے۔ بھیڑوں نے دوسری بار بچے دیے۔ پہلے بچے ماں کی پہچان بھولنے لگے۔ گرمی کا موسم ختم ہو گیا۔ برسات آنے کو تھی اور اکھاڑے کا کام پورا نہیں ہوا تھا۔ میں اپنے آپ اور دوسروں پر جھلاتا لیکن کام کی رفتار نہ بڑھی۔

باہر کے لوگ کہنے لگے کہ اب یہ کام نہیں ہوگا۔ ماسٹر نے گڈریوں کو بے کار تکلیف دی، پیسے برباد کیے۔ اصل میں اکھاڑے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مٹھی بھر لوگوں کے گاؤں کو اکھاڑا کس لیے چاہیے۔ کھیلنے والے بچے کھیت میں یا ریت میں کھیل لیں گے۔ ان میں سے جو پہلوان ہوگا وہ خود آگے بڑھ جائے گا۔ اگر اکھاڑا نہیں ہوگا تو وہ رُکنے کا نہیں۔ اکھاڑے کا سارا سوانگ ماسٹر نے پیسے کھانے کے لیے کھیلا ہے۔ تنخواہ سے پورا نہیں پڑتا اس لیے اس قسم کا ڈھونگ رچا کر گڈریوں کو جھانسا دینا اور اپنی جیب بھرنا اس کا اصل مقصد ہے۔ آخر کار میں نے تنگ آکر اوپر لکھ کر بھیج دیا کہ اکھاڑے کا کام پورا ہو گیا ہے۔ حضور مہربانی کر کے واڑی میں تشریف لائیں اور اکھاڑے کا افتتاح کریں۔ یہ چٹھی میں نے ڈاک میں روانہ کی اور واڑی کے لوگوں پر ظاہر کر دیا کہ سرکار حضور اس مہینے میں تشریف لا رہے ہیں۔ اکھاڑا یا تو پورا کرو یا ان کے سامنے جا کر کہو کہ ہم سے غلطی ہو گئی، یہ ہمارے بس کا کام نہیں ہے۔

دادو چغل خور ابھی بستر پر ہی تھا۔ اس کی بیوی اور بڑھیا ماں تعویذ گنڈا کر رہی تھیں مگر اس سے کچھ کام نہیں بن رہا تھا۔ دادو دن بھر چپ چاپ پڑا رہتا مگر دونوں وقت اچھے کھانے کے لیے چیخ پکار کرتا تھا "میں خوب کھاؤں گا۔ دودھ، گھی، چینی والی روٹی کھاؤں گا، بکرا مرغی کھاؤں گا اور ایک دن پھر جوان ہو جاؤں گا۔" وہ کچھ ایسی باتیں کرتا تھا۔ اس کی ضد کے مطابق گھر کے لوگ اسے کھلاتے تھے لیکن اس بیچارے کو ایسا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا اور نہ تو وہ کھایا ہوا پھلتا ہی تھا اور نہ دادو جوان ہو کر اٹھتا ہی تھا۔

بالا گڈریا اب بھی گاؤں کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں تھا۔ گاؤں کئی طرح کے روڑے اٹکا رہا تھا مگر وہ ضدی اپنی جگہ اڑا ہوا تھا۔ شبکو اور اس کی بلند قامت عورت کھیت میں کھپ رہے تھے۔ لکھیا کی اجلی چنچل آنکھیں لیے گاؤں میں گھومتی پھر رہی تھی۔ آنندا چھوٹی چھوٹی چوریاں کر کے گزارا کر رہا تھا۔ راما گڈریے کو ویسے ہی فرصت تھی۔ بھیڑیے کی بُو سے بھیڑیے کو تاڑ جانے والا باپ ابھی تک بھیڑیں چرانے جایا کرتا تھا۔

واڑی کے جوان گڈریے صبح سویرے اٹھ کر بھیڑوں کو چرانے جایا کرتے تھے اور دن بھر کھیتوں میں اور میدان میں گھوم گھام کر شام کو گھر آتے تھے۔ بھیڑوں کو باڑے میں بند کرتے اور آرام سے سو جایا کرتے۔ گڈریوں کی عورتیں روٹی سینکا کرتیں، سوت کاتتیں اور بچوں کو دودھ پلایا کرتی تھیں۔

اس طرح یہ سارا سلسلہ چل رہا تھا کہ ایک دن راجہ صاحب کو لکھے گئے خط کا جواب آگیا۔ اپریل کی ۲۰ تاریخ کو سرکار حضور واڑی میں تشریف لائیں گے۔ پھر تو آمد و رفت تیزی سے ہونے لگی۔ ہر

دوسرے دن تحصیل سے ایک نہ ایک عہدے دار آنے لگا اور معائنہ کرکے جانے لگا۔ تحصیل سے واڑی کو آنے والا راستہ اچھا بنا دیا گیا۔ جہاں سے سڑک شروع ہوتی تھی وہاں سفید پتھر رکھ کر واڑی کی راہ کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ میونسپلٹی کے لوگ آئے اور انھوں نے واڑی کے سارے لاوارث کتوں کو مار ڈالا۔ کھاد کے ڈھیر ہٹانے کا حکم دیا۔ ہر گھر نے اس پر عمل کیا۔ پاٹھ شالا کی مرمت کی گئی اور اسے چونے سے پُتوایا گیا۔ جہاں جہاں کوڑا کرکٹ اور گندگی تھی وہاں سے اٹھوا کر صفائی کی گئی۔ عہدیدار بولے کہ مہاراج گاؤں میں قدم رکھتے ہی ہو سکتا ہے پہلے ہی محلے یعنی راموشی محلے سے داخل ہوں اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ کس گھر میں گھس کر پوچھ تاچھ کریں۔ تب راموشی محلے کو صاف کرنے کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ ہر گھر کو لیپ پوت کر چمکایا گیا۔ راموشیوں نے اپنے گھر چمکائے تو گڈریوں کی بیویوں کو بھی جوش آیا اور انھوں نے بھی اپنے اپنے گھر لیپ ڈالے۔ بہت دنوں سے جو گھر باہر سے لپے پُتے نہیں تھے وہ اب پُت گئے۔ کچھ گھر ڈھے گئے تھے اور ان کے پتھر سڑک پر آ گئے تھے۔ انھیں اٹھا کر اچھی طرح جما دیا گیا۔ کچھ دھونس سے، کچھ خوشی سے یہ کبھی نہ ہونے والا کام ہونے لگا اور واڑی ایک ایسے گڈریے کے بچے کی طرح نظر آنے لگی جو نہا دھو کر اور بال بنا کر بدن پر کپڑے پہنے ہوئے ہو۔

اکھاڑے کا کام بھی قریب قریب پورا ہو چکا تھا۔ دیواریں کھڑی ہو گئیں، مچان نکل گئے۔ معماروں نے اپنا کام کافی حد تک پورا کر ڈالا تھا۔ لیکن بڑھئی ابھی پیچھے تھے۔ وہ تختوں کو رندا کر رہے تھے، کھونٹیاں چھیل رہے تھے اور چوکھٹیں جوڑ رہے تھے۔ پنت سرکار خود اپنے گاؤں میں آنے والے ہیں اس احساس سے بنگرواڑی میں سچ مچ بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ راجہ کے آنے کی خبر سن کر ایک آدمی بھی افسردہ ہونے والا نہیں تھا۔ واڑی کے گڈریوں میں سے کسی نے بھی اب تک کبھی راجہ کو نہیں دیکھا تھا اور یہ تو بالکل ان ہونی بات تھی کہ وہ خود واڑی میں آ رہا تھا۔ اس وجہ سے واڑی میں ایک نئی زندگی آ گئی تھی۔ آس پاس کے گاؤں دیہات والوں کو جلن ہونے لگی۔ واڑی کی طرف جو عہدیدار، پٹیل، پٹواری، تحصیل دار، تھانیدار کبھی جھانک کر بھی نہ دیکھتے تھے انھیں واڑی میں آنا پڑ رہا تھا اور جوں جوں دن بیتنے لگے عہدیداروں کا آنا جانا زیادہ ہونے لگا اور اسی قدر ہماری پریشانی بھی بڑھنے لگی۔ جلسے کے لیے میز لاؤ، کرسیاں لاؤ، ہار اور گلدستے لاؤ۔ پاٹھ شالا کے بچوں کے لیے نئے نئے کپڑے سلواؤ۔ گاؤں کے لوگوں سے کہو کر حجامت بنوائیں۔ راجہ کے آنے کے ساتھ ساتھ بہت سی پریشانیاں بھی آئیں اور ہم دوڑتے بھاگتے انھیں حل کرنے لگے۔ یہ بھاگ دوڑ آخری لمحہ

تک جاری رہی۔

اگلے دن صبح آٹھ بجے جشن کا افتتاح تھا اور ابھی تک اکھاڑے کی چھت تیار نہیں ہوئی تھی۔ دوپہر کے تین بجے تھے اور عمارت ابھی تک اوپر سے کھلی تھی۔ وقت طے ہو چکا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ اگر عین وقت پر مہاراج اس عمارت کو اوپر سے کھلی دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ میری ساری عزت ختم ہو جائے گی۔ واڑی کا مذاق اڑے گا یہ سوچ کر میں بے حد پریشان ہو گیا اور جا کر مکھیا سے کہا "مکھیا جی اکھاڑے کی چھت ابھی تیار نہیں ہوئی ہے۔ کل صبح حضور آ رہے ہیں اور اکھاڑے کی چھت ابھی نامکمل ہے، گاؤں کی آبرو چلی جائے گی۔"

مکھیا بڑبڑا کر اٹھا "ہیں! چھوکرے تو کیا کہہ رہا ہے۔ ارے! پھر گاؤں کو اکٹھا کر، گارا بنا چھت پاٹنے میں کیا دیر لگتی ہے!"

بڑی بھاگ دوڑ مچی۔ کام دھام چھوڑ کر ساری واڑی اکٹھی ہو گئی۔ گارا بنایا گیا۔ گارے سے اکھاڑے کی چھت تک سَو کے قریب آدمی کھڑے ہو گئے اور چھت پاٹنے کا کام شروع ہو گیا۔ ننگ دھڑنگ گڈریے گارے کے لوندے جلدی جلدی ایک دوسرے کے ہاتھوں میں پھینکنے لگے۔ پڑوس کے گاؤں سے بلائے ہوئے چمار دف بجانے لگے اور اس کی لے پر "اے ہاں" "اے لے" "آیا رے آیا" کی آوازوں سے چلاتے اور نعرے لگاتے ہوئے لوگ کام کرنے لگے۔ دف بجانے والے نے رفتار اور تیز کر دی۔ اس طرح کام کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔

شام ہو گئی۔ اندھیرا چھا گیا۔ چونکہ پہلے سے انتظام تھا اسی لیے گیس کی بتیاں جلا دی گئیں اور ان کی روشنی میں کام جاری رہا۔ ذرا بھی ڈھیل پڑتی تو مکھیا چلاتا، آیبو للکارتا اور کام پھر مستعدی سے ہونے لگتا۔ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ سارا گاؤں جاگ رہا تھا۔ گاؤں میں جھنڈیاں گاڑی جا رہی تھیں گاؤں کے بڑے دروازے تک آتے ہی راجا صاحب کو ۲۱ بیلوں کے رتھ میں بٹھا کر لانا تھا۔ اس کے لیے بیل اکٹھے کیے جا رہے تھے۔ رتھ کو سجایا جا رہا تھا۔ بندوبست کے لیے پولیس کے عہدے دار پہلے ہی آ گئے تھے اور بلا وجہ ہی ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے "حضور کل آئیں گے اور ابھی آپ کی تیاری پوری نہیں ہوئی ہے!" اس سلسلے میں اپنی چنتا ظاہر کر رہے تھے۔ اور چھت مکمل کرنے کا کام گیس کی روشنی میں چل رہا تھا۔

آدھی رات ہو چکی تھی۔ کام بس میں آ چکا تھا کہ اوپر کھڑا گارے کے لوندے پکڑنے والا آیبو یکایک نیچے گر پڑا اور گرا بھی پتھروں کے ڈھیر پر۔ گرتے گرتے بڑے خطرناک انداز میں چلّایا

"ارے میں مرگیا، میں مرگیا!" میں پاٹھ شالا میں بیٹھا کل کے جلسے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ جب آبیو گرا تو اس جگہ ہم میں سے کوئی نہیں تھا۔ وہ گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ کام رُک گیا۔ لوگ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر آبیو کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ہر طرف یہ شور سُنائی دیا "قصائی مرگیا، قصائی مرگیا۔" آنندا دوڑ کر مکھیا کے پاس گیا اور مکھیا نے دیکھا کہ اکھاڑے کا کام رُک گیا ہے اور بے حد شور و غل مچ رہا ہے۔

"ارے یہ تو بتاؤ کہ تم سب رُک کیوں گئے؟ قصائی گر پڑا تو گرنے دو۔ تم اپنا کام کیے جاؤ۔"

اس نے لوگوں کو دھکّے دے دے کر کام میں لگایا۔ آبیو کو اُٹھا کر میرے کمرے میں لے گئے اور کام پھر شروع ہو گیا۔ مُرغ نے صبح کی اذان دے دی تھی، اجالا ہونے ہی کو تھا اور موٹر آنے والی تھی، کسی کو مرنے تک کی فرصت نہیں تھی پھر رونے کے لیے کہاں ہوتی۔ پیاز پھوڑ کر آبیو کو سنگھائی، سر پر پانی چھڑکا لیکن آبیو آنکھ نہیں کھول رہا تھا۔ دروازہ بند کر کے مکھیا باہر آ گیا اور کام میں لگ گیا۔ یہ تو لگن کی بات تھی۔ مُردہ لاش کو ڈھانپ کر بھی کام کو پورا کرنا ضروری تھا۔ اور صبح بھی ہو گئی۔ گارے سے بھرے ہوئے جسموں کو دھونے اور نہانے کے لیے لوگ کنوئیں اور جھرنے کی طرف گئے۔

چار پانچ راموشیوں کو پیشوائی کے لیے ذرا آگے بھیجا گیا۔ سینگی بجانے والے کو درخت پر ذرا اونچی جگہ بٹھا دیا تاکہ میل دو میل کی دوری سے آتی ہوئی موٹر نظر آتے ہی وہ ہم کو اشارہ کر دے۔

آٹھ سوا آٹھ بجے کے قریب سینگی بجی۔ "سرکار آ گئے! آ گئے! آ گئے!" کا شور مچ گیا۔ بچّوں کو گود میں لے کر گدڑیائنیں بڑے دوار کی طرف دوڑنے لگیں۔ جو سپاہی انتظام کرنے کے لیے آگے کھڑے تھے انھوں نے ان کو ڈانٹ کر واپس بھیج دیا۔ ہم لوگ رتھ میں بیل جوت کر تیار ہو گئے۔ یہ ایک قدیم رسم تھی کہ راجہ کے گاؤں میں آتے ہی گاؤں کا پٹیل ہاتھ میں ایک ناریل اور ایک روپیہ لے کر ان کا استقبال کرے۔ ہماری واڑی میں نہ کوئی پٹیل تھا اور نہ پٹواری۔ چوں کہ سرکار حضور آ رہے تھے اس لیے پڑوس کے گاؤں کا پٹیل موجود تھا وہ بیچ میں ٹانگ اڑانے لگا۔ میں نے اُسے خاموش رہنے کو کہا اور طے کر لیا کہ لال صافہ اور مانڈ کی خوشبو دینے والا کرتا پہنے ہوئے ہمارا مکھیا ہی ناریل بھینٹ کرے گا۔ کچھ سہاگنوں کو آرتی کے ساتھ گاؤں کی حد پر کھڑا کر دیا۔ لوگ اُچک اُچک کر دیکھ رہے تھے کہ موٹر ڈھلان پر نظر آتی ہے یا نہیں۔ آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ راستے پر متعین راموشیوں کے بچے دوڑتے بھاگتے آئے اور ہانپتے ہانپتے انھوں نے بتایا "موٹر آ گئی ہے اور ماؤلی ماتا کی ڈھلان کے پاس آ پہنچی ہے!"

سب نے ٹوپیاں صافے ٹھیک کیے۔ عہدیداروں نے کوٹ کے بٹن بند کر کے قمیض نیچے کی

طرف کھینچ لی اور راستے پر کھڑے سپاہیوں نے سیٹیاں بجائیں۔ سرکار کی لال تختی والی نہایت صاف اور چمچماتی ہوئی گاڑی بڑے پھاٹک پر آکر کھڑی ہو گئی۔ میں جلدی سے آگے بڑھا۔ محکمۂ تعلیم کے افسر ساتھ تھے۔ جھک کر سرکار کو سلام کیا ہی تھا کہ انھوں نے کہا "یہ ہیں یہاں کے ماسٹر!" انگوٹھیوں سے بھرے ہوئے ہاتھ جوڑ کر سرکار بولے "جے پربھو" سب لوگ جلدی جلدی جھک گئے۔ گڈریوں نے زمین کو چھو کر اپنے راجہ کو نمسکار کیا۔ اس کے بعد تحصیل دار آگے بڑھے اور انھوں نے ادب سے کہا "اب یہ درخواست ہے کہ حضور یہاں سے رتھ میں بیٹھ کر گاؤں تک تشریف لے چلیں"۔

سرکار بولے "ہاں ہاں ضرور چلیں گے۔"

ملازم نے دروازہ کھولا۔ مہاراج باہر آئے۔ گڈریوں نے اپنے راجہ کو دیکھا۔ گورا چٹا خوبصورت راجہ، سر پر لال لال پگڑی تھی۔ جسم پر سفید کھادی کا لمبا کوٹ تھا، نیچے چوڑی دار پاجامہ تھا۔ پیروں میں لال جوتے تھے۔ چمکیلے کنارے والے دوپٹے کی پٹی ان کے چوڑے سینے پر تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، تیز ناک۔ مونچھیں سفید ہو رہی تھیں لیکن تھیں گھنی۔ لکڑی کا سہارا لے کر راجہ رتھ کی طرف چلا اور گڈریوں کی عورتیں آپس میں کہنے لگیں "راجہ تھک گیا ہے۔ اسے لکڑی کے سہارے چلنا پڑتا ہے۔" میں نے مکھیا کو اشارہ کیا۔ اس نے ہمت کر کے ناریل اور روپے کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ راجہ نے اسے ہاتھ سے چھو کر مکھیا کے کندھے پر ایک ہاتھ رکھ کر کہا "کیوں پٹیل ٹھیک ہو نا؟"

مکھیا ادب کے ساتھ ہنس دیا اور گردن ہلاتے ہوئے بولا "جی سرکار، جی سرکار"

بعد میں رتھ میں چڑھتے ہوئے بھی راجہ نے مکھیا کے کندھے کا سہارا لیا۔ ان کے بیٹھتے ہی بیلوں کو تھامے رکھنے والوں نے بیلوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور وہ رتھ کو کھینچنے لگے سینگی بجی، شہنائی بجی، ڈھول بجا۔ گڈریوں نے راجہ کی جے جے کار کی۔ پاٹھ شالا کے لڑکوں نے مہاراجہ زندہ باد کہا۔ آگے بڑھی ہوئی سہاگنوں نے آرتی اتاری۔ راجہ صاحب گاؤں میں داخل ہوئے۔ گڈریوں کے تیس پینتیس جھونپڑوں والے اس گاؤں میں آخر راجہ آپہنچا تھا۔

راجہ نے اپنے ہاتھ سے اکھاڑے کا بند دروازہ کھولا۔ پھر سینگی بجی۔ باجے والوں نے مل جل کر شور مچایا۔

اتنا بڑا اکھاڑا، ہودا، لال مٹی دیکھ کر راجہ خوش ہو گیا۔ اس نے کہا "کہاں ہے وہ ماسٹر؟"

میں ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

"بہت اچھا! بہت اچھا کیا بیٹے! کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے کہا "راجہ رام وِٹھل سوندنی کر۔"

تحصیل دار صاحب نے وضاحت کی "وِٹھل دھونڈوں کا لڑکا۔ وہ اپنے ہی یہاں کے کارکن ہیں۔"

سرکار بولے "اچھا، بڑھیا! بہت اچھی بات ہے تعلیم کے ساتھ طاقت کی پوجا ہونی ہی چاہئے" میں مارے خوشی کے پھول گیا۔ روئیں کھڑے ہوگئے۔ گلا رندھ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری آنکھوں میں اب آنسو آئے، اب آنسو آئے!

اکھاڑے کے ہنومان جی کو مہاراج نے خود ناریل چڑھایا اور اس کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ میں نے اپنی تقریر لکھ رکھی تھی۔ اُسے صاف لفظوں میں پڑھ کر سنا دیا۔ میرا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔

میں نے کہا کہ کھیلنے کے بہانے سے بچے اکھاڑے میں جمع ہوں اور کھیلنے کے ساتھ ہی ان میں پاٹھ شالا سے محبت کا جذبہ پیدا ہو اس مقصد کے لیے ہم نے اس اکھاڑے کو بنایا ہے۔ اکھاڑے کے لیے گاؤں والوں نے جو کوشش کی تھی اور جو قابلِ تعریف حوصلہ اور جو اتحادِ عمل ظاہر کیا تھا اس کی میں نے خوب بڑائی کی اور یہ کہہ کر اپنی تقریر کو ختم کر دیا۔

"سرکار حضور ان سب پر اپنی مہربانی کی نظر رکھیں اور انھیں دعا دیں۔"

پھر راجہ صاحب نے ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ انھوں نے کہا

"میرے ان بھیڑیں پالنے والے بچوں نے اپنی اس چھوٹی سی بستی میں ایسا خوبصورت اکھاڑا بنایا ہے یہ دیکھ کر میرا سر خوشی اور فخر سے اونچا ہو رہا ہے۔ طاقت کی پوجا اور علم حاصل کرنا میری ریاست کی خصوصیات ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ ریاست کے ہر طالب علم کا سینہ چوڑا، بازو بھرے ہوئے اور عقل تیز ہو اور میری ہمیشہ یہی خواہش رہے گی۔ مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ میری یہ بات یہاں کے گڈریوں تک پہنچی ہوگی۔ چنانچہ یہ صرف پہنچی ہی نہیں بلکہ یہاں اس کو عملی جامہ بھی پہنایا جا چکا ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران بھی ہو گیا ہوں اور خوشی سے آپ کے راجہ کا سینہ اور دو انچ پھول گیا ہے۔ جگد مبھا آپ کو عقلِ نیک عطا کرے اور آپ کو ترقی نصیب ہو۔"

پھر میں نے شکریہ ادا کیا۔ عاجزی سے سب کے احسان مانے۔ بچوں نے بندے ماترم گایا اور جلسہ ختم ہو گیا۔ مہاراج کی موٹر دھول اڑاتی ہوئی چلی گئی۔ دوسرے عہدے دار سائیکلوں اور بیل گاڑیوں میں چلے گئے۔ راجہ کیسا نظر آیا، کس طرح بولا اس کا گھر گھر چرچا ہوا۔ راجہ چلا گیا، جلسہ ختم ہو گیا لیکن گڈریوں کی خوشی ختم نہیں ہوئی۔ وہ جگہ جگہ جمع ہو کر زور زور سے ہنستے بولتے رہے۔ یہ خوشی ان کے

ساتھ بہت دنوں تک رہنے والی تھی۔

اس سارے جشن میں صرف دو آدمی نہیں آئے: بالا گڈریا اور دادو چغل خور۔ بالا کو جب معلوم ہوا کہ راجہ آنے والا ہے اور کسی نے کہا کہ دیکھنے چلو تو وہ بولا "میں اپنا کام چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ ہوگا راجہ اپنے لیے وہ کوئی میرا چولہا نہیں جلاتا۔"

چغل خور بری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا لیکن اس کے لیے اٹھنا مشکل تھا۔ اس نے مکھیا کو گھر بلا کر کہا "میں راجہ کو دیکھنے جانا چاہتا ہوں، کوئی مجھے پیٹھ پر بٹھا کر وہاں تک لے چلے۔"

لیکن مکھیا کو خطرہ سا نظر آیا کہ اگر اس بے شعور آدمی نے کچھ اول جلول بک دیا تو مزید پٹائی کی بات ہو جائے گی اس لیے اُسے بستر میں پڑا رہنے دیا گیا۔ دادو نے سب کو گالیاں بکیں، چیخا چلّایا لیکن اس کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا۔ جشن ختم ہو گیا تو مجھ سے کسی نے کہا کہ آیبو اکھاڑے کی چھت پر سے گرا ہے، بھاری چوٹ آئی ہے۔ اسے اٹھا کر کمرے میں ڈال دیا گیا ہے۔ میری خوشی فوراً ختم ہو گئی۔ ڈرتا ڈرتا، سٹپٹاتا ہوا میں گھر پہنچا۔ زنجیر کھول کر میں اندر گیا۔ آیبو اوندھا ہو کر کمبل پر پڑا تھا۔ میرا کلیجہ کانپ اٹھا۔ راجہ گاؤں میں آئے کیا اس لیے آیبو نے خود کو قربان کر دیا۔ میں زور سے چلایا "آیبو! آیبو! کیا زندہ ہو؟"

اُسے اوندھے سے چت کر کے میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بند آنکھیں کھول کر اس نے افسردہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس کی گرم سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی جو میرے گالوں کو محسوس ہو رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے اس نے کھلی ہوئی آنکھیں پھر موندلیں اور وہ کراہنے لگا۔ میں نے پوچھا "آیبو تجھے کیا ہوا؟ کیا بہت چوٹ آئی ہے؟ آیبو! ارے تجھے ہو کیا رہا ہے؟"

آیبو نے آنکھیں کھولیں۔ ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے کہا "ماسٹر کیا راجہ آیا تھا؟"

"ارے آیا بھی اور چلا بھی گیا۔ تجھے کیا ہوا ہے؟ گر کیسے پڑا؟"

آیبو کا چہرہ بہت افسردہ ہو گیا۔ اس نے کہا "راجہ آیا، ہم دیکھ بھی نہیں پائے!" اور پھر اوندھا ہو کر دوبارہ اسی طرح پڑا رہا۔

(۱۶)

راجہ آکر چلا گیا، اکھاڑا شروع ہو گیا۔ جو کام پچھلے کئی مہینوں سے جاری تھا پورا ہو گیا۔ اکھاڑے کے شوق کی وجہ سے سبھی بچّے جمع ہونے لگے۔ ڈنڑ بیٹھک پیلنے لگے اور آپس میں زور کرنے لگے۔ گجی

کے ناچ کا ڈھول، لیجم کے لوازم، لاٹھیاں، پٹے، بنیٹھی، یہ سارا سامان اکھاڑے میں رکھا جانے لگا۔ اچھے خاصے بڑی عمر کے آدمی بھی یوں ہی مزے میں لال مٹی میں لوٹنے لگے۔ پاٹھ شالا پھولنے پھلنے لگی۔ صبح اور دوپہر دونوں وقت بیس کے قریب لڑکے بالے باقاعدہ آنے لگے۔

اوپر سے گر پڑنے کی وجہ سے آیبو کا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا تھا اور اندرونی چوٹ کافی لگی تھی۔ ہاتھ ٹھیک کرنے کے لیے آنندا نے اپنے لوگوں میں سے ایک راموشی کو میرے پاس بھیج دیا۔ اس کا نام تھا جگنیا۔ اچھے خاصے چہرے مہرے کا یہ لڑکا عین عالم شباب میں تھا۔ وہ گھر آکر روزانہ آیبو کی مالش کرنے لگا۔ آنندا نے مجھے بتایا تھا کہ ہڈیاں بٹھانے کا گر جگنیا نے اپنے باپ سے سیکھا تھا اور وہ واڈی کا مشہور شکاری تھا۔ پیٹ کے بل رینگتے ہوئے توڑے کی بندوق سے ہرن مارا کرتا تھا۔ اس نے بہت سے ہرن مارے تھے۔ اس کے پاس ہرنوں کے اتنے سینگ تھے کہ چار کمروں والے گھر میں لگائے جا سکتے تھے۔ آخر بوڑھا ہو کر جب اس نے بستر سنبھال لیا تو ہرن کی طرح چلّانے لگا۔ سیکڑوں ہرن مارنے والا تاتیا بار اموشی ہرن کی طرح چلّاتا ہوا مرا۔ جگنیا کی مالش کی وجہ سے آیبو کی اتری ہوئی ہڈی ٹھیک بیٹھ گئی اور مہینہ پندرہ دن میں چوٹیں بھی ٹھیک ہو گئیں تو وہ گھومنے پھرنے لگا۔ قصائی کا بیٹا مرتے مرتے بچا لیکن بیچ میں ہی جگنیا نے ایک مصیبت کھڑی کر دی اور اُسے سدھارتے سنوارتے گاؤں کا ناک میں دم آگیا۔

بنگرواڈی سے پانچ چھ کوس دور ایک گاؤں تھا جس کا نام تھا بانگی۔ ہماری ساری تحصیل میں یہ گاؤں غنڈہ گردی کے لیے مشہور تھا۔ قتل و خون، غارت گری اور مار پیٹ کے لیے اس کا بڑا نام تھا۔ اس گاؤں میں پرایا آدمی خون کا گھونٹ پی کر ہی رہتا تھا۔ پاٹھ شالا کا ماسٹر، پٹیل، پٹواری سبھی اس گاؤں میں غیر مقامی ہونے پر ڈرتے کانپتے رہتے تھے۔ وصولی کی خاطر تحصیلدار بھی لگان کی بات اس گاؤں میں اتنی نرمی سے کرتا تھا گویا بھیک مانگ رہا ہو۔ کام کاج کے لیے جگنیا ہمیشہ بانگی جایا کرتا تھا۔

ایک دن دوپہر کو آٹھ دس جوان آدمی واڈی میں آگھسے۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں، بھالے تھے۔ ریشمی صافے باندھے ہوئے اور ململ کے کرتے پہنے ہوئے یہ جوان واڈی میں گھستے ہی سیدھے راموشی محلے میں گئے۔ جلدی جلدی انھوں نے سب راموشیوں کی جھونپڑیوں کی تلاشی لی، عورتوں پر دھونس جمائی اور ان کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور ایک دو راموشیوں کو کلہاڑی کے پھل کے الٹے سرے سے مارا۔ راموشی محلے میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ بچے ڈر ڈر کر کانپنے لگے، کتے

بھونکنے لگے۔ راموشیوں کی ڈری ہوئی عورتیں بچوں کو اٹھا کر گڈریوں کی پناہ میں آگئیں۔ گڈریے چراگاہ گئے ہوئے تھے۔ نوکر چاکر زیادہ تھے نہیں۔ ایسی حالت میں ان ہٹے کٹے لوگوں نے جھونپڑیوں کی تلاشی لینی شروع کی ہی تھی کہ بھاری شور مچ گیا۔

میں پاٹھ شالا میں تھا۔ آنندا بھی میرے ساتھ تھا۔ یہ سُن کر کہ راموشی محلّے میں کچھ لوگ گھسے ہیں وہ جلدی سے اُدھر چلا گیا تھا۔ بچوں کی جماعت کو چھوڑ کر میں بھی اُدھر گیا۔

اسی درمیان میں جھونپڑیوں کی تلاشی لے کر وہ لوگ راستے پر آکھڑے ہوئے تھے۔ آنندا آگے بڑھا اور اس نے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟"

اس نے فوراً پہچان لیا کہ یہ لوگ بانگی کے ہیں۔ آنندا کے یہ بات پوچھتے ہی ایک چھوکرا اس پر چڑھ آیا اور بولا "تو بھی شاید راموشی ہی ہے۔"

آنندا کے "ہاں" کہتے ہی اس چھوکرے نے اس کی پیٹھ پر لکڑی کے دو تین ہاتھ جما دیے اور گالی دے کر پوچھا: "جگنیا راموشی کہاں ہے؟"

لکڑی کے وار سہہ کر آنندا جگہ سے ہٹتے ہوئے بولا "کیوں، اس نے کیا کیا ہے؟"

اس پر اس چھوکرے نے ایک وار اور کر دیا۔ پھر مجھ سے نہیں رہا گیا۔ آگے بڑھ کر میں نے اس چھوکرے کو پکڑ لیا اور پوچھا "تم لوگ کون ہو؟ اور اچانک گاؤں میں گھس کر کیوں مار پیٹ کر رہے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ کوئی تم سے جواب تک بھی طلب نہیں کرے گا؟"

میں یوں تو دبلے پتلے جسم کا تھا لیکن میرے منہ سے خود بخود بڑی تیز بات نکل گئی اور ایک لمحے کے لیے اس چھوکرے کو اپنا ہاتھ چھڑانے کا بھی ہوش نہیں رہا۔

اس کے بعد ایک چھوٹے قد کا مگر ہٹا کٹا آدمی آگے آیا۔ چھوکرے کو ایک طرف کھینچ کر اس نے میرے سینہ سے سینہ بھڑاتے ہوئے کہا "تو کون ہے جو اتنا تاؤ میں آرہا ہے؟"

"میں سرکاری نوکر ہوں، یہاں کی پاٹھ شالا کا ماسٹر ہوں۔ شرافت سے پوچھیے کہ آپ کو کس آدمی کی تلاش ہے۔ یہ کوئی اندھیر نگری نہیں ہے کہ یوں مار پیٹ کیے جاؤ۔"

اسی درمیان میں ٹوٹے ہاتھ میں لکڑی لے کر آبو پہنچ گیا تھا۔ پاٹھ شالا کے چار پانچ مضبوط لڑکے بھی اکھاڑے سے لاٹھیاں لے کر آگئے تھے۔

میرے سینہ سے سینہ جوڑ کر جو جوان کھڑا تھا وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر کچھ ڈھیلا پڑ گیا اور ناک پُھلا کر بولا "ہمیں جگنیا راموشی کی تلاش ہے۔"

میں نے کہا " دو چار دن سے وہ گاؤں میں نہیں ہے ۔"

" یہ کیسے مانیں کہ یہ بات سچ ہے ۔"

" اس لیے کہ میں کہہ رہا ہوں ۔"

" ارے ماسٹر! تو تو بڑا تند مزاج آدمی ہے ۔"

اتنے میں واڑی کی ایک بڑھیا آگے آئی اور صافے والے کی تھوڑی پکڑ کر کہنے لگی " ارے میرے بیٹے غریب راموشی پر کیوں کلہاڑی چلا رہا ہے ۔ تو تو خاندانی مراٹھا ہے ۔ راموشی تو تیرے پیر کی گند ہیں ۔ آرام سے بیٹھ ، دھوپ میں آیا ہے ۔ پانی پی ، کوئی کام ہو تو اس ماسٹر سے پوچھ ۔"

اس کے بعد شور مچاتی ہوئی راموشیوں کی اور عورتیں بھی جمع ہو گئیں ۔ گڈریوں کی بیویاں بھی آ گئیں اور بانگی کے ان جوانوں پر گالیوں کی بوچھار پڑنے لگی ۔

میں نے بانگی کے لوگوں سے کہا " اکھاڑے میں چلیے ۔ وہاں اس سلسلے میں بات کریں گے کہ آپ کیوں آئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں ۔ بے کار مار پیٹ کرنا اچھے آدمی کے لیے اچھی بات نہیں ہے ۔"

اب کیا بتائیں کہ انھیں کیا محسوس ہوا " چلیے " کہہ کر وہ چل پڑے ۔ بچوں کا قافلہ پیچھے پیچھے آنے لگا ۔ عورتیں بھی ساتھ تھیں ۔ اس پر مجھے سب کو ڈانٹنا پڑا ۔ ڈانٹنے کے بعد پھر کوئی نہیں آیا ۔

میں ، آنندا ، راما اور وہ سب لوگ اکھاڑے میں پہنچے ۔ میں نے کہا " اب بتائیے ۔"

ان میں سے ایک نے کہا " ہم لوگ بانگی کے ہیں ۔ تمھارے گاؤں کا راموشی چھوکرا جگنیا ، بانگی سے ہماری ذات کی ایک بیوہ کو لے اڑا ہے ۔ ہم اس لیے آئے ہیں ۔"

اب میری سمجھ میں آ گیا کہ یہ لوگ اس طرح یکایک مار پیٹ پر کیوں اُتر آئے ۔ ان کی ناراضی بالکل قدرتی تھی ۔ جگنیا نے کوئی ایسا کام کیا ہوگا ، ہمیں اس کا دھندلا سا بھی تصور نہیں تھا ۔ راما اور آنندا بھی اس خبر سے حیران رہ گئے ۔ جگنیا کو گالی دیتے ہوئے آنندا بولا " گھر میں کھانے کو اناج نہیں ہے اور بیٹے کو رنڈی بازی سوجھ رہی ہے ۔ پٹیل ، آپ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کی جان لے لیجیے ۔ واڑی کا ایک بھی آدمی آپ کی مزاحمت نہیں کرے گا ۔"

آنندا نے جب یوں رُخ پلٹا تو وہ لوگ بھی سیدھے ہو گئے اور اچھی طرح بات کرنے لگے ۔ بیوہ عورت ہو اور اس کا کوئی نہ ہو تو بھی یہ سارے گاؤں کی عزّت کا سوال تھا ۔ راموشی ہم میں سے ایک عورت کو نکال کر لے گیا ، یہ سیاہی ہمارے منھ پر لگ گئی ہے ۔ ان کا یہ خیال مناسب بھی تھا ۔ آنندا بولا " وہ یہاں ہوتا تو اسے لاتوں سے روندتا ہوا آپ کے سامنے لے آتا اور ہم اپنے ہاتھوں

سے اس کی کھوپڑی پر پتھر مارتے۔"

وہ لوگ بولے "جائے گا کہاں؟ جہاں بھی ہوگا ہم اُسے کھوج نکالیں گے اور مار ڈالیں گے۔"

"ہاں ہاں! اجی وہ غریب کہاں جائے گا۔ آپ کے سامنے اس کی کیا ہمت ہے۔"

مجھے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کہوں۔ یہ بُرے آدمی جگنیا کے پیچھے ایسے پڑے تھے جیسے پاگل کتے کے پیچھے پڑے ہوں۔ اگر وہ ان کی پکڑ میں آجائے تو اُسے مار ڈالنے سے گریز کرنے والے نہیں تھے۔ آخر آنندا نے کہا "حضور! جس طرح یہ بات آپ کی بے عزتی ہے اسی طرح ہم راموشیوں کی بھی۔ آپ واپس جائیے میں کھنڈوبا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس عورت اور جگنیا کو آٹھ دن کے اندر آپ کے سامنے لاکر کھڑا کر دوں گا۔"

بانگی کے لوگ سوچ بچار کرنے لگے اور آنندا بولا "کیوں ماسٹر جی؟"

"ٹھیک ہے۔ جگنیا نے اگر گناہ کیا ہے، تو اسے پکڑ کر ان لوگوں کے سامنے کھڑا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

آمبو نے سارا گاؤں ڈھونڈ کر بہت سی مونگ پھلی اور گڑ جمع کیا اور یہ لاکر بانگی کے لوگوں کے سامنے رکھا۔ ذرا دیر بعد منکی بھر کے چائے لے آیا اور ان مہمانوں کو جو مونگ پھلی کھا چکے تھے، دھات کی طشتری سے اصرار کر کر کے چائے پلائی۔

آنندا کی بات مان کر اور مجھے ضامن بنا کر بانگی کے باسی چلے گئے اور ہم لوگ انھیں گاؤں کے باہر تک پہنچانے گئے۔ جب وہ لوگ نظروں سے اوجھل ہو گئے اور ہم واپس لوٹے تو میں نے پوچھا "ارے آنندا! اگر جگنیا نہ ملا تو کیا ہوگا؟"

آنندا نے گلے کو صاف کر کے تھوکا اور بولا "اپنے آپ کو راموشیوں کی اولاد نہیں کہوں گا ماسٹر جی اُسے شمشان سے بھی ڈھونڈ لاؤں گا۔ پیچھا کر کے اسے واپس لاتا ہوں یا نہیں آپ اسے دیکھ لیجیے۔"

بڑے تڑکے اُٹھ کر آنندا راموشی جگنیا کا پیچھا کرنے نکل پڑا۔ اس کے ساتھ اور بھی دو تین جوان لڑکے تھے۔ ہاتھوں میں کلہاڑی یا لاٹھی لے کر یہ تین چار آدمی ایسے نکلے جیسے ہرن کے شکار کے لیے نکلتے ہیں۔ آنندا کو اچھی طرح معلوم تھا کہ واڈی کے راموشیوں کا آنا جانا کہاں تھا۔ جگنیا کو یہاں سے گئے دو ہی دن ہوئے تھے۔ اتنے میں لمبا فاصلہ طے کر کے وہ موٹر سے ریل کے اسٹیشن تک پہنچ گیا ہو اور اس نے بمبئی جانے والی گاڑی پکڑ لی ہو اس کا امکان نہیں تھا کیوں کہ اس کو یہ تو یقین ہوگا ہی کہ میرے غایب ہوتے ہی میرا پیچھا کیا جائے گا اور پہلے موٹر کا راستہ اور پھر اسٹیشن

کی جستجو ہو گی۔ قدرتی طور پر وہ جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے دور تو گیا ہو گا لیکن گیا ہو گا کسی جانی پہچانی جگہ ہی۔ پہچان کی جگہ تو گاؤں گاؤں میں تھی لیکن خاص بات یہ تھی کہ دس بارہ کوس کے فاصلے پر نمرج نامی گاؤں میں جگنیا کی بہن بیاہی ہوئی تھی۔ آنندا اس گاؤں کی سمت چل پڑا اور دوپہر کے کھانے کے وقت بہنوئی کے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔

مہمانوں کے آتے ہی جگنیا کی بہن گھبرا گئی۔ مانگ تانگ کر آٹا لائی اور گرم گرم روٹیاں پکا ڈالیں۔ سالن بنایا اور انھیں پیٹ بھر کھلایا۔ یہ لوگ کھا پی کر اٹھے اور آنندا نے پان کھاتے کھاتے بیزبان، جگنیا کے بہنوئی سے پوچھ تاچھ کی

"جگن ناتھ آیا تھا کیا؟"

بہنوئی ذرا چوکنا ہو گیا اور اس نے جواب دیا "جی نہیں، ادھر نہیں آیا۔"

آنندا کو اندازہ تو تھا ہی۔ بہنوئی کا چونکنا اس کی تیز نظر سے بچ نہیں سکا۔ وہ سمجھ گیا کہ جگنیا یہاں آکر گیا ہے اور اس نے بہنوئی کو بتا دیا ہے کہ وہ عورت کو بھگا کر لایا ہے۔ آنندا بولا "آپ سے جھوٹ کیوں بولوں۔ جگنیا نے بڑا گدھا پن کیا ہے۔ بانگی کے بھلے گھر کی عورت کو بھگا لایا ہے۔ اس گاؤں کے سّو کے قریب آدمی کلہاڑیاں اور بھالے تان کر واڑی پر آئے۔ میں نے پیر پکڑ کر کہا وہ عورت اور جگنیا میں آپ کے حوالے کر دیتا ہوں، آپ گاؤں کو نہ ستاؤ۔" لوگ لوٹ گئے ورنہ واڑی میں دو چار لاشیں ضرور پڑ جاتیں۔

بہنوئی کو شاید تفصیل معلوم نہیں تھی، اس کا چہرہ کچھ متفکر ہو گیا۔ اندر جگنیا کی بہن بے چین ہو گئی۔ لیکن جگنیا آیا تھا اس بات کو نہ مانتے ہوئے بہنوئی نے کہا "جگن ناتھ نے غلط بات کی ہے، اپنی اوقات بھول کر آگے بڑھ گیا۔ عورت لے جانے میں حرج نہیں تھا مگر کم سے کم اپنی ذات کی لے جاتا لیکن خیر۔ میں کہتا ہوں آپ اُسے پکڑ کر کیا کریں گے۔ عورت کی مٹی ہوئی عزت تو واپس آئے گی نہیں، اسے کوئی اپنی ذات میں لے گا نہیں۔ پھر وہ لوگ جگن ناتھ کا کیا کریں گے۔ مار پیٹ کریں گے، جان لے لیں گے، اس پر بھی جو بات ہو چکی ہے کیا اس کا کفارہ ادا ہو جائے گا؟"

آنندا بولا "صحیح ہے، نہیں ہو گا۔"

"پھر آپ کیوں خون کھولا رہے ہیں۔ ان دونوں کو رنگ رلیاں کرنے دو۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔"

ایک نکتۂ نظر سے تو بہنوئی کا کہنا ٹھیک تھا لیکن وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ جگنیا تو اس عورت

کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا رہے گا لیکن بانگی کے لوگ اس کا جھونپڑا جلا دیں گے، اس کے گھر کے لوگوں کو ماریں گے۔ ایک کی خاطر سارے راموشی محلے کو آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ ساری واڑی کو پریشانی بھگتنی پڑے گی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں آدمی تھے بھی کتنے اور ان کی طاقت بھی کتنی تھی۔

آنندا نے اس راموشی کو یہ بات بہت سمجھائی مگر وہ رضا مند ہوتا ہی نہیں تھا۔ سالے کا ٹھور ٹھکانا نہیں بتا رہا تھا۔ کافی بات کرنے پر بھی جب اس سے سراغ نہیں ملا تو آنندا اٹھا اور بولا "اچھی بات ہے، تو پھر ہم دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے، جے رام جی کی۔"

بہنوئی بھی جے رام جی کی کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا لیکن اتنے میں مُگنیا کی بہن اندر سے باہر آئی اور پریشان سی ہو کر بولی "آنندا جگو آیا تھا۔"

گھر والا اُسے لال آنکھوں سے گھورنے لگا۔ اس پر بھی اس نے منہ بند نہیں کیا۔

"اسٹیشن کی طرف گیا ہے، عورت ساتھ ہے۔ سانگلی جانے کا ارادہ نظر آ رہا ہے لیکن یہ خیال رکھنا کہ اس کی جان پر کچھ نہ بنے۔ دیکھو میری جان کی قسم۔"

آنندا بولا "بے فکر رہ! آخر وہ ہمارا بھی کچھ لگتا ہے کہ نہیں۔ ہم کیسے اسے مرنے مارنے دیں گے یہاں سے کب گیا؟"

"علی الصبح ہی۔ ابھی گاڑی میں بیٹھا نہیں ہوگا۔"

میرج کی طرف جانے والی گاڑی اسٹیشن پر تین بجے آتی تھی۔ جلدی جلدی رخصت لے کر بار بار ڈھارس بندھا کر آنندا وہاں سے چل پڑا۔ دھوتی کی لانگ باندھ کر، چپل ہاتھ میں لے کر انھوں نے اسٹیشن کی راہ لی۔ تیز اور گرم دھوپ میں یہ راموشی دوڑنے لگے اور دیکھتے دیکھتے انھوں نے تین چار کوس کا فاصلہ طے کر لیا۔ آخر دور راستے کے کنارے والے برگد کے نیچے ایک عورت اور ایک جوان انھیں نظر آیا۔

مُگنیا بھی بڑا ہٹا کٹا تھا، موڑ کی طرح بھاگنے والا تھا لیکن اس کی ہمراہی میں ایک بھرے بدن کی گوری عورت تھی۔ ایک تو عورت ذات اور اس پر بھاری جسم اور اوپر سے خوف طاری! ظاہر ہے ان سے راہ کو تیزی سے طے کرنا ممکن نہیں ہو سکا۔ جگہ جگہ اٹھتے بیٹھتے سایہ میں آرام کرتے وہ دونوں ابھی راستے میں ہی تھے۔

آنندا ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اچھی طرح دیکھا اور ساتھ کے ایک لڑکے

سے کہا "جگنیا ہی ہے، اس کا لال صافہ چمک رہا ہے، لیکن اب کیا کریں وہ تو بھاگ جائے گا؟"
لڑکے بولے "بھاگنے دیجیے۔ پیچھا کر کے خرگوش کی طرح گرا دیں گے۔"
"ہاں اور وہ بھاگ بھی جائے تو عورت تو ہے ہی۔"
"اُسے کیا کاٹ کر کھانا ہے۔ ہمیں تو جگنیا چاہیے۔"
"وہ بھی کہاں جائے گا۔ چلو نیچے کی طرف دیکھ کر چپ چاپ چلو۔"
پھر چھوکرے چاروں طرف بکھر گئے۔ انھوں نے اس جوڑے کو سب طرف سے گھیر کر درمیان میں لے لیا اور بڑی ہوشیاری سے چھپ چھپ کر وہ جگنیا کی طرف بڑھنے لگے۔
جگنیا بار بار سورج کی طرف دیکھ رہا تھا "اب چلو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"
لگاتار چلنے سے وہ عورت تھک چکی تھی۔ اس نے اپنی خشک زبان کو پھٹے ہوئے ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا "ذرا ٹھہر جاؤ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ جگنیا یکایک گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پیچھے کی طرف دس پندرہ ہاتھ کی دوری پر آنندا کو دیکھ کر عورت کا ہاتھ پکڑ کر اُسے گھسیٹتے ہوئے بولا "اری اب تو بھاگ۔ ہمیں پکڑنے کے لیے آدمی آ پہنچے۔"
وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر جان کی بازی لگا کر دوڑ پڑے۔ آنندا پیچھے سے چلّایا "جگنیا رُک جاؤ۔ مت بھاگو۔"
لیکن جگنیا ہوش کھو چکا تھا اور عورت کا بھی یہی حال تھا۔ دونوں اصل راستے کو چھوڑ کر پیچھے کی طرف دیکھے بغیر کالے کھیت میں دوڑنے لگے۔ عورت کا پلّو ہوا میں لہرا رہا تھا۔ جگنیا کے صافے کا سرا بھی لہرا رہا تھا۔ پتھر، روڑے اور مٹی کی پروا کیے بغیر وہ دونوں تیزی سے بھاگتے چلے گئے اور آنندا ان کا پیچھا کرنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے دم پھولنے کی وجہ سے وہ عورت دھم سے کالی مٹی میں گر پڑی۔ جگنیا پیچھے مُڑ کر اسے اٹھانے لگا کہ اتنے میں لڑکے نزدیک آ پہنچے۔ جس طرح گری ہوئی ہرنی کو چھوڑ کر کالا ہرن جان لے کر بھاگتا ہے اسی طرح جگنیا اس کو اس حالت میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔
عورت کے پاس پہنچتے ہی لڑکے ٹھٹک گئے مگر آنندا جگنیا کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ ان کی یہ دوڑ کافی دیر تک چلتی رہی۔ جگنیا جوان تھا، آنندا کے بس میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر کم فاصلہ دیکھ کر آنندا نے ہاتھ کی کلہاڑی اس پر پھینکی اور بھاگتے ہرن کو جس طرح گراتے ہیں، اسی طرح جگنیا کو گرا دیا۔ بھاگتے بھاگتے دم پھولا ہوا تھا۔ جگنیا جانور کی طرح چت ہو کر نیچے گر پڑا۔

آنندا ان کو گاڑی میں ڈال کر بانگی لے گیا۔ پیر سے خون بہہ جانے کی وجہ سے جگنیا کا رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ وہ عورت اپنی موت ہی مر رہی تھی۔ آنندا بولا

"یہ رہی تمھاری عورت اور یہ ہے تمھارا چھوکرا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اسے مارا ہے۔ بچی ہوئی جان اگر آپ لینا چاہتے ہوں تو لے لیجیے۔"

جگنیا ہوش میں نہیں تھا۔ اس کی دھوتی اور انگرکھا خون سے تر ہو گئے تھے۔ لوگ اس عورت کو ملتے پیٹتے گھر لے گئے اور آنندا سے کہا "جا اسے اپنے گاؤں میں لے جا کر جلا دے۔"

جگنیا کو لے کر آنندا واڈی میں آیا۔ جڑی بوٹی استعمال کر کے ان گنواروں نے جگنیا کے پاؤں کا زخم ٹھیک کر دیا۔ بانگی کے لوگوں نے اس عورت کی خوبصورت ناک کاٹ ڈالی اور اسے گاؤں سے نکال دیا۔ ناک پر پٹی باندھ کر وہ جگنیا کے گھر آئی اور خوب روتی رہی۔ اُسے راموشی محلّے میں رہنے کی اجازت دینے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ ایک دن وہ اٹھ کر کہیں چل دی اور اس کے بعد کہیں دکھائی نہیں دی۔

(۱۷)

جون کا مہینہ آیا۔ اگہن تک چوماسہ گزر گیا اس موسم میں کبھی ٹھیک سے بارش نہیں ہوئی اس سال بھی واڈی کے علاقے میں یہی حال رہا۔ ہر سال تھوڑا بہت چھینٹا تو پڑ جاتا تھا لیکن اب کے اتنا بھی نہیں ہوا۔ یہ موسم خشک ہی گزر گیا اور لوگ اگلے موسم کی راہ دیکھنے لگے۔ سارا میدان اُجڑا ہوا نظر آتا تھا۔ بھیڑیں جنگل میں گھوم کر بھوکے پیٹ واپس آ رہی تھیں۔ فصل کے وقت کی جمع شدہ سوکھی پتیاں بھوسا اور ایسی ہی متفرق چیزیں کھلا کر گڈریے بھیڑوں کا پیٹ بھر رہے تھے اور منتظر تھے کہ کب پانی برسے اور ہریالی ہو۔

انھیں دنوں مکھیا نے پَو پھٹے کے وقت ایک بھیانک خواب دیکھا۔ کمر میں نیم کی ٹہنی باندھے ہوئے اور ماتھے پر کم کم کا لیپ کیے ہوئے بال کھولے ایک عورت آئی اور بولی "تیاری کر میں تجھے لے جانے کے لیے آئی ہوں۔"

بوڑھے نے ڈر کر پوچھا "کہاں؟"

عورت بولی "بھگوان کے گھر، کل چلنا ہے، جلد تیاری کر۔"

مکھیا چونک کر جاگ اٹھا۔ پسینہ پسینہ ہو کر بہت دیر بستر پر ہی بیٹھا رہا۔

منہ اندھیرے ہی جب کہ میں ابھی پوری طرح جاگا بھی نہیں تھا، مکھیا میرے یہاں آیا۔ بستر

کے کونے پر بیٹھ کر اس نے میرے پاؤں چھو لیے اور مجھے پرنام کیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ مکھیا بولا "یہ آخری جے رام جی کی ہے، میں تو چلا"۔

جب سے میں آیا تھا مجھے یاد نہیں کہ وہ بوڑھا کبھی گاؤں چھوڑ کر گیا ہو۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں اور کب جا رہے ہیں؟"

بوڑھا بولا "بس ابھی جا رہا ہوں اور لوٹ کر نہیں آؤں گا"۔

"کیا مطلب؟"

"کل صبح تک میں مر جاؤں گا۔"

یہ کوئی مذاق نہیں تھا۔ بوڑھا سچ مچ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ جب میں نے ہنس کر مذاق کیا تو اس نے سپنے کی بات بتائی۔

میں نے کہا "مکھیا جی، کہیں آپ پاگل تو نہیں ہو گئے، کیا کبھی سپنے بھی سچ ہوتے ہیں؟"

مکھیا بولا "ہوتے ہیں بیٹے، اور میرے تو پہلے بھی سچ ہوئے ہیں"۔

"ہشت، آپ نے اپنے دماغ میں بچوں کی طرح بے کار کچھ بھر لیا ہے۔ اگر سمجھ دار لوگ ایسا کرنے لگیں تو کام کیسے چلے گا"۔

بوڑھا بار بار ایسی باتیں کر رہا تھا گویا سارا کاروبار آخری بار سمیٹ رہا ہو۔ لیکن میں نے اس کی ایک نہیں مانی۔ آخر میں اس نے کہا "میں اپنا سب کچھ انجی کو دوں گا۔ اسے شیکوا کے حوالے کیے دیتا ہوں، وہ اسے سنبھالے گا، اس کا بیاہ کر دے گا۔ آپ بھی دھیان رکھیے گا"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

دن بھر اِدھر اُدھر گھوم کر مکھیا نے سب سے یہ بات کہی اور سب سے رخصت مانگی لیکن اس پاگل پن پر کس کو یقین آسکتا تھا۔ بہتوں نے مذاق کیا۔ بوڑھے کی بات کو کسی نے بھی نہیں مانا۔ شیکوا بڑا بزرگ تھا لیکن اس نے بھی کہا "نانا، مرنے کی ایسی کونسی بات ہے یا تم پر مصیبت ٹوٹی ہے تم تو ابھی پانچ سال تک نہیں گرتے۔ چلو گھر چلو!"

کسی نے کچھ کہا، کسی نے مخول اڑایا یا مذاق کیا تو بھی مکھیا کو جن جن سے محبت تھی ان سب سے ملتا ہوا وہ سارا دن گھومتا رہا۔ آخر شام ہوئی، بھیڑیں جنگل سے آئیں اور کوئی شخص مجھ سے یہ کہنے کے لیے دوڑا آیا کہ "چلیے، مکھیا کو قے اور دست لگ گئے ہیں"۔

میں دوڑتا دوڑتا گیا۔ بوڑھے کی حالت بالکل خراب ہو گئی تھی۔ آنتیں کھنچ گئی تھیں، منہ سوکھ

گیا تھا۔ اس سے صاف بولا بھی نہیں جارہا تھا۔ میرے جاتے ہی وہ نہایت آہستگی اور نہایت کمزور آواز میں بولا "بابا جھوٹ نہیں ہے، مجھے بلاوا آگیا ہے۔"

میں نے ڈانٹ کر کہا " ہونہہ، کوئی بلاوا نہیں آیا، کل صبح تک ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

گھریلو علاج شروع ہو گئے۔ "یہ دو۔ وہ پلاؤ۔ یہ چاٹنے کو دو" لیکن آدھی رات ہو گئی مگر فائدہ نہیں ہوا۔ اس پر سب کی ہمت ٹوٹ گئی۔ انجی اور شیکو رونے لگے۔ بوڑھے کے رشتہ داروں کی آنکھیں بھر آئیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اور رونے کی آواز سن کر مکھیا بولا "ارے روتے کیوں ہو؟ اب میری حسرت ہی کیا رہ گئی ہے۔ اتنے بڑے سرکار حضور آئے۔ انھوں نے بھی مجھے 'کہو پٹیل'، کہا، میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ میری اب کوئی آرزو نہیں رہی۔"

سورج طلوع ہوا اور مکھیا چل بسا۔

ایک بوڑھا کیا گیا ساری واڑی سونی نظر آنے لگی۔ مجھے ایسا نظر آنے لگا کہ اب میرا کوئی مددگار نہیں رہا۔ وہ پاٹھ شالا اور وہ اکھاڑا دیکھ کر مجھے اداسی محسوس ہونے لگی۔ گھر جاتا تو آٹھ آٹھ دن پاٹھ شالا واپس نہیں آتا تھا۔

(۱۸)

ایک بار اچانک ہی شیکو کی دراز قد بیوی میرے یہاں آئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ وہ آئی اور دروازے کے پاس سکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ میں اچھی طرح بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگی "ماسٹر جی! کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں، ابھی کھانا کھایا ہے، بیٹھے بیٹھے پڑھ رہا تھا۔ آئیے، بیٹھیے۔"

میرے یہ کہنے سے اس کی ہچکچاہٹ کچھ کم ہوئی۔ پہلو میں بندھی ہوئی سیر بھر مونگ پھلی اس نے نیچے انڈیل دی اور کہا "مونگ پھلی کھائیے۔ ہمارے پاس آپ کو دینے کے قابل اور ہے ہی کیا۔"

پھر بھی شیکو کی گھر والی بیٹھی نہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے میں اسے سمجھ گیا۔ بوڑھا مکھیا مرتے وقت انجی کو شیکو کے حوالے کر گیا تھا اور کہہ گیا تھا "اس کا بیاہ کر دینا۔"

بوڑھے کے مرجانے کے بعد سے انجی شیکو کے گھر رہتی تھی۔ اس کے گھر رہ کر انجی نے اسے پھانس لیا تھا۔ پینتیس سے اوپر کی عمر کا شیکو انجی کے پیچھے پاگل ہو رہا تھا۔ یہ بھنک میرے کان میں پڑ چکی تھی لیکن مجھے اس کا یقین نہیں تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ کسی نے ایسے ہی یہ افواہ پھیلا دی

ہے ۔ "کہیں یہ عورت وہی تو کہنے نہیں آئی !" یہ خیال میرے من میں آنے لگا لیکن ایسی بات غیروں سے کون کرتا ہے ۔

شیکو کی گھر والی نہ تو بیٹھ رہی تھی اور نا ہی کچھ بول رہی تھی ۔ اس لیے مجھے کچھ عجیب سا لگنے لگا ۔ خود بخود پوچھوں تو یہ بھی اچھا نہیں لگتا تھا ۔ آخر میں نے یوں ہی کہا

"کھیتی باڑی کا کیا حال ہے ؟"

جب کہیں شیکو کی گھر والی دہلیز سے لگ کر دونوں پیروں پر بیٹھ گئی اور ہاتھ کی مٹھی گال پر ٹکا کر بولی "میں اپنے مالک کا کیا کروں ماسٹر جی ؟"

میں نے کہا "کیوں ؟ کیا ہو گیا ؟"

اصل میں مجھے سب معلوم ہو چکا تھا مگر میں کہہ کیسے سکتا تھا ۔ کم سے کم اسے اتنی تو تسکین ملتی کہ بات چار آدمیوں میں پھیلی نہیں ہے ۔

اس پر اس نے زمین پر آنکھیں گاڑ کر کہا

"بڑائی تو سب میں بیان کرو لیکن بے عزتی کو دل میں چھپاؤ ، میں تو اس کی قائل ہوں لیکن انھوں نے تو حد ہی کر دی ہے ۔ ان کا ایسا برتاؤ کیا ٹھیک ہے ؟"

میں نے کہا "کیا کچھ کہا سنی ہو گئی ؟"

"کہا سنی ہو گی تو کیا ہو گا ، دوسرا بیاہ کرنے کو کہتے ہیں !"

جھوٹی حیرت کو ظاہر کرتے ہوئے میں نے کہا "کون شیکو ؟ اسے یکایک یہ کیا سوجھی ؟"

"یکایک کیسے ۔ مکھیا مر گیا ، بے چارہ بھلا آدمی تھا لیکن مرتے مرتے میری گرہستی میں آگ لگا گیا ۔"

شیکو کی گھر والی کا گلا رندھ گیا ۔ آنکھوں میں پانی بھر آیا ۔ اس نے پلّو سے آنسو پونچھ کر اور گلے کو صاف کر کے نیچی آواز میں کہا "ہمیشہ اس چھوکری کے پیچھے پیچھے رہتے ہیں وہ بھی جوان چھوکرے کو دکھانے کے قابل نخرے دکھاتی رہتی ہے ۔ میں یہ دیکھ کر کیسے چپ رہوں گی ۔ مان لو اسے سمجھ نہیں ہے لیکن کیوں نہیں ہو گی ، اب تو نہاتی دھوتی ہے ! لیکن یہ کیسے کہ شرم نہیں ہے ورنہ یہ کیوں اس کے پیچھے پاگل ہو جائیں ۔ لوگوں کی نہ سہی لیکن من کی لاج تو ہونی چاہیے اور آپ جیسے لوگ کیا کہیں گے ۔ اس بوڑھے نے چھوکری سنبھالنے کے لیے دی تھی ۔ اچھا سا لڑکا دیکھ کر اس کا بیاہ کر دیتا تا کہ سب تعریف کرتے ۔ وہ بات چھوڑ کر اسے اپنے ساتھ باندھ رکھا ہے ۔ کام دھام کچھ نہیں ، ساری لائیے ، چولی لائیے ۔ اب آپ ہی بتائیے کیا یہ بات ٹھیک ہے ؟"

اس پر میں نے جھوٹ موٹ حیرت کا اظہار کیا اور نقلی غصہ میں آکر کہا
"آپ ہی یہ بات کہہ رہی ہیں تو اسے سچ ماننا پڑے گا ورنہ شیکو ایسا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ جو سوکھے پتوں پر بھی پیر نہ رکھے وہ ایسا نہیں کرے گا لیکن جب آپ ہی کہتی ہیں تو یہ بات غلط کیسے ہو سکتی ہے۔"
"میں جھوٹ کیوں کہنے لگی۔ کیا اس میں اکیلے ان ہی کی آبرو جا رہی ہے، میری نہیں جاتی؟ جب تک بات آخری حد تک نہ پہنچ جائے ایسی بات کیا کوئی کسی سے کہے گا؟"
"ہش! یہ شیکو کا گدھا پن ہے۔ اتنے دنوں کی کمائی ہوئی عزت کھونے پر اتر آیا ہے۔"
میری یہ بات کہنے سے کہ شیکو کی بدنامی ہو رہی ہے، یہ سمجھ کر اس عورت نے جلدی سے وضاحت کی
"ویسے وہ اس لڑکی کو برباد کرنا نہیں چاہتے، بیاہ کرنے کو کہہ رہے ہیں۔"
"لیکن بیاہ کرنے کا کوئی رواج ہے۔ اور اُسے دوسرے بیاہ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟"
"میں بے اولاد ہوں، بچے کے لیے بیاہ کر رہے ہیں۔"
اس پر میں لاجواب ہو گیا اور یہ بات میرے چہرے سے بھی ظاہر ہونے لگی اور جو کچھ مجھے کہنا چاہیے تھا وہ شیکو کی اس عقل مند بیوی نے کہہ دیا۔ "بچہ نہیں ہے، یہ بات تو صحیح ہے لیکن کیا کوئی جائداد ضایع ہو رہی ہے؟ اگر ہمارے نیک اعمال ہوں گے تو کیا بھگوان دے گا نہیں، کیوں ماسٹر جی؟"
میں نے کہا "تو پھر کوئی دوسری لڑکی دیکھ کر ڈھنگ سے بیاہ کریں۔"
"کس لیے؟ دو آدمیوں کے کھانے کو تو پورا نہیں ملتا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ کام کیسے چل رہا ہے اور وہ جو آئے گی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی کوکھ ضرور پھلے گی۔ ویسے بھگوان چاہے تو سوکھے ٹھونٹھ میں بھی پھل لگ سکتا ہے۔"
میں سن رہا تھا اور بیچ بیچ میں بول رہا تھا۔ یہ ان گڑھ عورت جس نے ماتھے پر کم کم کا بڑا بھاری ٹیکہ لگا رکھا تھا بولتی چلی جا رہی تھی۔ خاوند کے ساتھ برابر کا کھیتی کا کام کرنے والی۔ بیل کے ساتھ ہل کھینچنے والی، یہ عورت خاوند کے اس برتاؤ سے کتنی مصیبت میں پڑ گئی تھی۔ اس انجی کی چٹیا پکڑ کر اُسے باہر نکال دینا اس کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ لیکن اُسے ایسا کرنا منظور نہیں تھا اور وہ ایک ماسٹر کے سامنے بیٹھی گڑگڑا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ نتھنے کانپ رہے تھے، ہونٹ لرز رہے تھے۔ میرے من میں جو خیالات اٹھے عین ممکن تھا کہ اس کے من میں بھی اٹھے ہوں۔ انجی کا قصور نہیں ہے۔ وہ جوان ہو گئی ہے۔ اُسے بھلے بُرے کا خیال نہیں ہو سکتا کوئی کتنا ہی کہے، شیکو کا اس پر مائل ہونا بھی قدرتی تھا۔ یہ سارا معاملہ اتنا نازک تھا کہ یہاں کلائی

کا زور بے کار تھا اس عورت نے یہ بات سمجھ لی ہوگی۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو وہ ایک پرائے آدمی کے سامنے اپنا من نہ کھولتی۔

میں بار بار یہ کہہ رہا تھا "شیکو کا یہ برتاؤ ٹھیک نہیں ہے، اسے سمجھانا چاہیے۔"

آخر شیکو کی بیوی نے کہا "ماسٹر جی میں آپ کے پاس اس لیے آئی ہوں کہ آپ گاؤں کے عقل مند آدمی ہیں، پنت سرکار تک آپ کی رسائی ہے۔ آپ ذرا انھیں ڈانٹیے۔ اگر ہوگا تو آپ ہی کے کہنے کا اثر ہوگا۔"

"لیکن بھئی یہ تو گھریلو معاملہ ہے۔ میں کہوں اور وہ سامنے سے یہ کہہ دے کہ 'تو مجھے پوچھنے والا کون ہے' تو میری کیا عزت رہ جائے گی؟"

اس پر ہاتھ مٹکا کر شیکو کی بیوی نے کہا "ہوں وہ کیا پوچھیں گے! ہاتھ میں کھٹ سے ہتھکڑی پڑ جائے گی اتنا اچھی طرح سے سمجھتے ہیں۔"

اس طرح بات چیت چل رہی تھی کہ پاٹھ شالا کی گھنٹی بجی۔ آیبو، ستا اور بچے آ گئے۔ شیکو کی بیوی اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "اچھا، جاتی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ مونگ پھلی کا ڈھیر ویسے ہی پڑا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر آیبو نے پوچھا "کیا نانی مونگ پھلی لائی تھی؟"

"ہاں بھئی۔"

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"اب تک نہیں آئی تھی، میں نے سوچا آج کیوں آئی ہے۔"

آیبو نے صرف اتنا ہی کہا اور میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس نے مونگ پھلی اٹھا کر رکھ دی اور دروازہ بند کر دیا۔ میں پاٹھ شالا کی طرف چل پڑا۔ مجھے کچھ ایسا لگا کہ شاید آیبو کو اس بات کا علم نہ بھی ہو۔ اس نے یوں ہی پوچھ لیا ہوگا اور میں نے اپنے ہی من سے اس کا مطلب ایسا سمجھ لیا ہوگا۔

اس کے بعد آتے جاتے وقت راستے میں شیکو دو چار بار ملا لیکن میری طرف دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ہنسا نہیں۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ "ماسٹر جی کیا گڑبڑ ہے؟" مجھے دور سے دیکھ لینے کے بعد گردن نیچی کر کے تیزی سے میرے پاس سے گزر جاتا۔ اس کے روکھے برتاؤ کی وجہ سے انجی کے

کے باب میں اس سے پوچھنے کی مجھے جرأت نہیں ہوئی۔ انجی اور شیکو کے متعلق گاؤں میں کانا پھوسی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ دونوں روزانہ ساتھ ساتھ بکریاں چرانے جاتے تھے۔ راہ چلتے ہوئے بھی انجی شیکو سے جُڑی ہوئی سی چلتی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ آج ان دونوں کو نالے کے کنارے والی جھاڑی میں دیکھا کل ماؤلی ماتا کے مندر میں جاکر ان دونوں نے قسمیں کھائیں۔ انجی نے دیوی کی چولی کی سوگند لے کر قسم کھائی کہ وہ شیکو سے دغا نہیں کرے گی۔ پرسوں شیکو نے بکری بیچ کر انجی کے لیے توڑے بنوانے کو دیے ہیں۔ ایسی طرح طرح کی باتیں چل رہی تھیں۔ شیکو کے اس عشق کا معاملہ جوان چھوکروں کے مذاق کا موضوع بن گیا تھا اور سمجھدار آدمیوں میں لعنت ملامت کی بات بن گئی تھی۔

پھر ایک دن شیکو اور اس کی عورت کا زبردست جھگڑا ہو گیا۔ یہ کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ بات کیا ہوئی کیوں کہ وہ دونوں آدھی رات کے وقت اپنے گھر میں ہی لڑ پڑے اور صبح سے گھر والی گاؤں ہی میں الگ رہنے لگی۔ دولا گڈریے کے پاس والا باڑا خالی تھا وہ اس میں چولھا بنا کر رہنے لگی کھیتی باڑی کی طرف دھیان چھوڑ دیا اور مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگی۔ اس نے شیکو کا نام لینا ہی چھوڑ دیا۔

انجی اور شیکو اکٹھے رہنے لگے۔ شیکو بیاہ کے انتظام میں لگ گیا۔ اس نے بھیڑیں اور بکریاں بیچ کر نقد روپیہ اکٹھا کیا اور اناج وغیرہ بھی اکٹھا کر لیا۔

شیکو کا کھیت گاؤں سے کچھ دور تھا۔ اس کے کھیت کی طرف جو آبپاشی کا کھیت تھا وہ 'یرڈشی' گاؤں کا تھا۔ وہ واڑی کے قریب تھا۔ بھیڑیں اس باغ میں کھاد کے لیے بیٹھنے لگیں۔ باغ کے مالک نے کسی اور گاؤں کے گڈریے بلوائے تھے۔ ان میں سے دو تین جوان گڈریے رات بھر بھجن گاتے اور آگ تاپتے ہوئے اس کھیت میں بیٹھے رہتے۔ ان بھجنوں کی لَے اور سروں کو انجی اپنے کھیت میں سنتی تھی۔ ان میں سے ایک دن ایک گڈریا کڑی دوپہر میں شاملاتی مینڈ پر لگے ہوئے ببول کے ایک درخت پر چڑھا اور ببول کو کاٹنے چھانٹنے لگا۔ اس کی بھیڑیں نیچے جمع ہو گئیں اور کانٹوں کو چھوڑ کر ببول کی پتیاں کھانے لگیں۔ ببول کی ہری اور سفید پتیوں کو چننے لگیں۔

انجی تیزی سے آگے بڑھی اور نیچے کھڑے ہو کر درخت پر چڑھے ہوئے اس جوان کی طرف دیکھ کر بولی "ارے کون ہے جو ببول چھانٹ رہا ہے؟"

گڈریا نیچے دیکھ کر بولا "کیوں ری، تجھے کیا اعتراض ہے؟"

اس کے دفعتاً "کیوں ری" کہتے ہی انجی کا من جذبات سے بھر گیا۔ ببول کے پیلے پھول اس کے بدن پر جھڑی کی طرح برسے اور فوراً بعد گڈریا بھی نیچے کود پڑا۔ کالا کلوٹا، لیکن اچھے ناک نقشے والا جوان گڈریا، انجی کے سامنے بڑے ٹھسے سے کھڑا ہو گیا۔ انجی کو اس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس کی چھاتی زور سے دھڑکنے لگی۔ آس پاس کوئی تھا نہیں۔ ببول کی چھاؤں میں بھیڑیں ٹہنیاں کھا رہی تھیں اور وہ مسٹنڈا انجی کے سامنے کھڑا تھا اور کہنے لگا "مہمان سے یوں ڈپٹ کر بات نہیں کرنی چاہیے، کیا یہ کھیت تمہارا ہے؟" انجی نے نیچی نظریں کرتے ہوئے بڑے رعب سے کہا "کیا میں ایسے ہی کہہ رہی ہوں؟"

گڈریا بولا "پھلی ہوئی ببول کو دیکھ کر چھانٹنے کا خیال آگیا" اور اس نے ڈھٹائی کے ساتھ انجی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انجی چیخی چلائی اور نہیں نہیں کہنے لگی مگر گڈریے کی مضبوط پکڑ سے اس کا ہاتھ چھوٹ نہیں سکا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انجی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا "میری چوڑی ٹوٹ گئی ہے، چھوڑ دو نا میرا ہاتھ۔" پھر بھی گڈریا ہنستا ہی رہا۔

چار پانچ دن کھیت میں بھیڑیں بٹھا کر اور اس کے معاوضے میں جوار لے کر وہ گڈریا بھیڑوں کو ہانکتا ہوا اپنے گاؤں کو چلا گیا اور انجی کو بھی ساتھ لے گیا۔ وہ بھی چلی گئی شیکو سے اس نے کہا تک نہیں۔

چولی کی قسم توڑ کر انجی نے شیکو کو چھوڑ کر دوسرا خصم ڈھونڈ لیا۔

اس کے دس پندرہ دن بعد ڈھیر ساری گاجریں لے کر شیکو کی گھر والی میرے یہاں آئی۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ گاجروں کو زمین پر پٹکتی ہوئی بولی "ماسٹر جی ہمارے بدھو خیر سے گھر واپس لوٹ آئے ہیں!"

(۱۹)

اس کے بعد ماؤلی ماتا کا میلہ آگیا۔ یہ میلہ ہر سال بنگرواڑی میں لگا کرتا تھا۔ گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا۔ اس پر ایک معمولی سی مڑھیا تھی بالکل اسی طرح کی جیسی لوگ کھیتوں میں بناتے ہیں۔ اس میں ماؤلی ماتا کی مورتی تھی۔ چاروں طرف چٹانیں تھیں ایک یا دو فٹ اونچی تروٹے کی جھاڑیوں یا کیکر کے ایک آدھ سوکھے پیڑ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ گڈریوں کی منتیں پوری کرنے والی یہی دیوی تھی۔ اتنے دنوں تک یہ مڑھیا ہی میں رہی اور گاؤں والوں نے ایک چھوٹا سا مندر بھی کیوں نہیں بنوایا؟ ایک بار کوشش تو ہوئی تھی لیکن دیوی نے پجاری سے خواب میں کہہ دیا تھا مندر مت بنواؤ میں جس حال

میں ہوں اسی میں خوش ہوں۔

واڈی کے سب لوگ اچھے اچھے کپڑے پہن کر اس سنسان جگہ پر جمع ہو گئے۔ پڑوس کے دیہات کے کچھ عقیدت مند بھی آ گئے۔ تقریباً ڈیڑھ سو آدمی جمع ہو گئے۔ پجاری نے پوجا کی اور لوگوں کو گلال لگایا۔

گاؤں سے ٹکر لینے والا گڈریا بالا بھی میلے میں آیا۔ بیوی بچے بھی اس کے ساتھ آئے۔ اسے دیکھتے ہی واڈی کے لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ "اسے روکو، اسے دیوی کے پاس مت جانے دو۔" اس طرح کا شور مچ گیا۔ لیکن کسی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بالا، دیوی کے پاس آیا۔ اس کے قدموں میں گرا اور پرساد کا گلال لگانے کے لیے اس نے اپنا ماتھا پجاری کے سامنے بڑھا دیا۔ اس پر پجاری بولا "تو سارے گاؤں کی برادری کو نہیں مانتا، میں تیرے ماتھے پر گلال نہیں لگاؤں گا۔"

بالا بڑا اتند مزاج تھا لیکن پجاری کے گلال لگانے سے انکار کرتے ہی نہ جانے اسے کیوں سانپ سونگھ گیا۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ لوگوں کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ پچھلے چند مہینوں سے اس نے بہت تکلیف برداشت کی تھی۔ گاؤں کا کوئی بھی آدمی اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ انھوں نے بالا گڈریے کو کوڑھی کی طرح دور کر رکھا تھا۔ آج اس کی برداشت کی حد ہو گئی۔ دیوی کا پرشاد تک اُسے نہیں ملا۔ جو شخص گاؤں کی مخالفت سے قابو میں نہیں آیا تھا وہ آج بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ دھوتی کا پلّہ گاؤں والوں کے سامنے بچھا کر وہ چلّا کر بولا "میں اپنے گاؤں کے سماج کے سامنے اپنا دامن پھیلاتا ہوں، میری غلطی معاف کر دو، مجھے برادری میں واپس لے لو اور مجھے گلال لگاؤ۔ میرا پیر ڑے لو، میرا گھر لے لو میری جان تک لے لو لیکن مجھے یوں دور نہ پھینکو۔"

اس کا سخت لہجہ کانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں۔ اتنا بڑا مجمع ایک لمحہ کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔ اس پر راما کا بوڑھا کاکوا گاؤں والوں سے کہنے لگا "ارے اگر بچہ گود میں پیشاب کر دے تو کیا جانگھ کاٹ ڈالو گے۔ چلو اُسے گلال لگاؤ۔"

لوگ پھس پھس کرنے لگے۔ پھر سب نے مل کر کہا "لگاؤ" اور پجاری نے گاؤں کے سامنے دامن پھیلا کر کھڑے ہوئے بالا کے ماتھے پر گلال ملتے ہوئے کہا "ماؤلی ماتا کی جے"

پھر لوگوں نے "جے" کا شور مچا دیا مٹھیاں بھر بھر کے گلال لگایا، شکر قندی اور گاجریں لٹائیں اس پرساد کو اٹھانے کے لیے غول کے غول نیچے جھکے۔ خوب دھکا پیل ہوئی اور چیخ پکار مچی۔

باجے والوں نے ڈھول بجائے، شہنائی پھونکی اور ہر سال کے حسب معمول دولا گڈریے کے جسم میں دیوی آئی۔ وہ "ہو ہو" کر کے مستی میں شور مچانے اور انگڑائیاں لینے لگا۔ باجے والوں

نے تیزی سے دف بجانا شروع کیا۔ اسی رفتار سے دولا بھی تیزی سے ناچنے لگا۔ اس نے کمبل اتار پھینکا، سر کا صافہ بھی اتار دیا۔ نیم برہنہ دولا کھڑا ہو کر زور زور سے گانے لگا۔ پجاری نے اسس کے ماتھے پر گلال پوت دیا۔ کالے کلوٹے ماتھے سے گہرے لال رنگ کا گلال بہہ کر ناک تک اتر آیا۔ دولا گڈریا ناچنے لگا۔ "ماتا جی آگئیں، ماتا جی آگئیں" یہ کہتے ہوئے سب گڈریے اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔

شیکو نے پوچھا "ماں اس سال پانی نہیں برسا، کیا بھول ہو گئی ہے؟"

ماتا جی بڑے زور سے بولیں "بہت پاپ ہوئے ہیں، شہد پن بہت بڑھ گیا اس لیے برکھا بھی روٹھ کر چلی گئی ہے۔"

"لیکن ماں برکھا نہ ہوئی تو بھیڑیں کیا کھائیں گی اور ہم کیسے جئیں گے؟"

ماتا جی آنکھیں بند کر کے بولیں "میرا میلہ اچھی طرح لگاؤ اور مجھے اچھے طریقے سے مٹھائی اور ناریل کی بھینٹ دو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"پانی برسے گا؟"

"ہاں برسے گا!"

"لیکن ماں کب؟ بارش کا موسم نکل گیا۔ ساری دنیا میں بارش ہوئی لیکن وادی کے آسمان پر ایک بادل تک نظر نہیں آیا۔"

"ارے یہ اس لیے ہوا ہے کہ تمھیں سبق مل جائے لیکن اب پانی برسے گا اور اسی موسم میں برسے گا۔"

شیکو نے اپنے منہ پر طمانچے مار مار کر منہ لال کر لیا۔

"ماں غلطی کو معاف کر دو، تمھارا میلہ ٹھیک سے لگائیں گے، مٹھائی ناریل کا چڑھاوا چڑھائیں گے۔ ہمیں سب کچھ منظور ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دولا کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

اس کے بعد دیوی دولا کے جسم سے نکل گئی اور وہ دھم سے گر پڑا۔

اس کے بعد لوگوں نے میلہ لگایا۔ ہر سال کے معمول کے مطابق دیوی کو بکرے کی بَلی چڑھائی۔ آبو نے چھری پھیری۔ شیکو نے دیوی کو خون چڑھایا اور اسس کے سامنے پرساد رکھا۔ جب کہیں گوشت بنانا شروع ہوا۔ لوگ چاروں طرف جمع ہو گئے۔ بچّوں کی بھیڑ جمع ہو کر دیکھنے لگی۔ اس پر آبو نے سب کو ڈانٹ کر کہا "گھر جاؤ، روٹی لے کر کھانا کھانے آؤ۔"

"اپنے گھر سے روٹیاں لے کر یہاں آئیے یہاں آئیے۔ سالن یہیں ملے گا۔" بنگر واڑی بھیڑیں دے

سکتی ہے، جوار کہاں سے لائیں؟"

آہستہ آہستہ لوگ چلے گئے۔ کچھ خاص خاص آدمی رہ گئے۔ انھوں نے گہرا گڑھا کھود کر آگ جلائی۔ اس پر بڑے ہنڈے چڑھائے جن میں دو تین بکروں کا گوشت پکنے لگا اور اس کی بو پھیلنے لگی۔

چاندنی چھٹک گئی، مشعلیں جل گئیں۔ چھوٹی چھوٹی پراتیں، لوٹے اور روٹیاں لے کر گڈریے آ گئے اور قطاروں میں بیٹھ گئے۔ ایک طرف سے ذرا اونچی کر کے رکھی گئی پراتوں میں گرم گرم سالن پروسا گیا۔ ماتا کی جے جے کار ہوئی لوگ روٹی سالن پر ٹوٹ پڑے اور زور شور سے کھانے لگے۔ اس تیز مرچوں والے سالن سے ان کے منھ جل گئے اور ناک سے پانی بہنے لگا۔

(۲۰)

ماؤلی ماتا نے خوف تو دور کر دیا لیکن ستاروں کی ایک گردش کے بعد دوسری گردش نکل گئی اور بنگرواڈی پر پانی کی بوند بھی نہیں گری۔ تپتی ہوئی زمینیں ٹھنڈی نہیں ہوئیں۔ درخت اور پودے بُری طرح سوکھ گئے۔ بھوکی بھیڑوں نے کھیتوں اور میدانوں کا تنکا تنکا چن لیا۔ دھول بھی گرم ہو گئی۔ بگولے اٹھنے لگے، کنووں کا پانی سوکھ گیا اور واڈی کا چشمہ بھی خشک ہو گیا۔ ناریل کے چھلکے سے کھرچنے پر بھی مٹی سے بھرے ہوئے گندے پانی سے گاگر بھی نہیں بھرتی تھی۔ صبح ہو یا دوپہر لوگ پانی کے لیے چشمے پر ایک ہجوم سا بنائے رہتے تھے۔ شام کے وقت چڑیوں کے لیے بھی پینے کا پانی نہیں بچتا تھا۔ رات بھر پھوٹتے رہنے کے بعد چشمے میں ذرا سا پانی ملتا تھا۔ اُسے بھرنے کے لیے عورتیں تڑکے ہی اٹھ کر جانے لگیں۔ کووں کے جاگنے سے پہلے آدمی جاگ کر پانی کے لیے جھگڑنے لگتے۔

جانور دُبلے ہو گئے۔ ان کی پسلیاں نظر آنے لگیں اور جسم پر ریچھ کی طرح بال بڑھ جانے کی وجہ سے وہ میلے دکھائی دینے لگے۔ اون اتارے جانے کی وجہ سے بھیڑیں پہلے پہلے ہی سے گنجی ہو گئی تھیں اور اب دبلی پتلی نظر آنے لگیں۔ ان کی چربی بالکل سوکھ گئی۔ چھپر کی پرانی گھاس نکال کر لوگ جانوروں کے سامنے رکھنے لگے۔ پانی کی خاطر بھیڑوں کو دور دور تک لے جانا پڑتا تھا۔ چڑیاں، کوے، ہولے نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔ بھوک سے بلبلاتے ہوئے کھیتوں کے چوہے گاؤں میں آ گئے اور ہڑبونگ مچانے لگے۔ انھوں نے گڈریوں کے کمبل کتر ڈالے، اناج کی خوشبو کی وجہ سے چھاج ٹوکریاں تک کتر ڈالیں۔

لوگوں کے چہروں کی رونق غائب ہو گئی۔ ان کی آنکھوں سے بھی بھوک نظر آنے لگی۔ گھر میں

جمع شدہ اناج کم ہونے لگا تو وہ روپیہ دو روپیہ لے کر بازار میں جانے لگے اور بڑی منت سماجت سے حاصل کردہ مہنگا اناج لانے لگے۔ ان کے گھروں میں دو دو دن چولھا نہیں جلتا تھا۔ اکھاڑے میں آنے والے بچّے اناج کی تلاش میں دور دور تک جانے لگے۔ پاٹھ شالا میں آنے والے بچّے اناج حاصل کرنے کے لیے قریب کے دیہات کے چکّر کاٹنے لگے۔ اکھاڑا ویران ہوگیا، پاٹھ شالا جاڑ ہوگئی۔ اناج حاصل کرنے کے لیے سبھی ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ سارا ضلع ہی قحط کی زد میں آگیا تھا جو قحط اس علاقے کی بنیادی خصوصیت تھی آخر وہ پھر سامنے آگیا تھا۔

لوگ خوفزدہ ہوگئے۔ راما گنڈریے کا چہرہ کالا پڑ گیا۔ پاٹھ شالا میں اس کا روز کا چکر کم ہونے لگا دو چار دن بیچ میں خالی ہی گزر جاتے۔ آنے پر بھی اس کی بات چیت میں قحط کے سوا کوئی دوسرا موضوع نہیں ہوتا تھا۔

"ماسٹر جی! اس سلسلے میں ایک کتھا آتی ہے کہ رام لکشمن بھگوان کا نام جپتے ہوئے گھومنے لگے۔ گھومتے گھومتے اس علاقے میں آگئے۔ دوپہر ہوگئی اس لیے وہ دونوں بھائی رام گھاٹ پر سایہ دیکھ کر کھانا کھانے بیٹھے۔ ان کے بیٹھتے ہی زور کی بارش آئی اور برسنے لگی۔ رام کو غصّہ آگیا اور ایک بان مار کر بارش کو سیدھا اونچے گھاٹ کی طرف بھگا دیا تب سے اس سرزمین میں پانی نہیں آیا اور اب آپ دیکھیے رام گھاٹ پر پانی برستا ہے اور ہمارے سر سے کالے بادل یوں ہی گزر جاتے ہیں اور پھر جا کر اس اونچے گھاٹ پر برستے ہیں۔"

یہ بات درست تھی۔ صرف بیچ والی پٹی بارش کی عنایت سے محروم رہ جاتی تھی۔

خوراک کی کمی ہونے کی وجہ سے بھیڑیں دُبلی ہوگئی تھیں اور ان کے کمزور جسموں پر طرح طرح کی بیماریاں حملہ کرنے لگی تھیں۔ چیچک کی وبا آئی اور بھیڑوں کے منھ پر چیچک نکل آئی۔ بخار آجانے کی وجہ سے وہ اپنی جگہ سے اُٹھتی بھی نہیں تھیں۔ قابلِ رحم آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی یوں ہی بیٹھی رہنے لگیں۔ کچھ کو کچھ ایسی سردی لگی کہ ان کا سر پھر گیا۔ وہ پاگل بھیڑیں اپنے ہی جسم کے چاروں طرف گھومنے لگیں اور اس طرح گھومتے گھومتے چکّر کھا کر زمین پر گرنے اور مرنے لگیں۔ کچھ کے پیر لنگڑانے لگے اور وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے چلنے لگیں۔ لوگ کہنے لگے "بھیڑ کو ہولے نے جھپٹ لیا۔ لال ہولا اس کی پیٹھ پر بیٹھا اور اُڑتے وقت اس نے پر پھڑپھڑائے اس کی وجہ سے زخمی بھیڑ کمر سے لولی ہوگئی۔ کچھ کو ناک کی بیماری ہوگئی، ناک بہنے لگی اُس پر کوّے چونچ مارنے لگے۔ گڈریے کوّوں کو غلیل سے مار کر انھیں باڑے پر لٹکانے لگے۔ کچھ کی رال بہنے لگی اور ان کے پیر سڑنے لگے لیکن وہ کسی چیز کو بھی منھ نہیں

لگاتی تھیں۔

ان تمام بیماریوں سے بھیڑیں تو زیادہ نہیں مریں، لیکن کچھ ریوڑوں میں مہلک وبا پھیل گئی اور بھیڑیں تیزی سے مرنے لگیں۔ یہ بیماری براگڈریے کے ریوڑ میں آگھسی۔ بھیڑوں کو بیٹھے بیٹھے ہی پتلے دست آنے لگے۔ باڑے میں ہر طرف گندگی پھیل گئی۔ اس گندگی سے بھیڑوں کے جسم بھر گئے، مکھیاں بھنبھنانے لگیں اور بھیڑیں دھڑا دھڑ مرنے لگیں۔ روز صبح کو پانچ دس بھیڑوں کی لاشیں ملتیں۔ اس کا بیٹا ستّابے چارہ روزانہ لاشوں کو گھسیٹ کر گاؤں کے باہر پھینکنے جاتا۔ چمڑے کی قیمت بہت کم ہوگئی۔ آس پاس کے مہار آتے اور پانچ چھ آنے فی کھال کے حساب سے خرید کرلے جاتے شروع شروع میں مہار مری ہوئی بھیڑیں لے گئے، لیکن بعد میں انھیں بھی اس سے نفرت ہوگئی۔ بھیڑوں کا چمڑا اتار لیتے اور بھیڑیں کھیتوں میں پڑی سڑتی رہتیں۔ خدا جانے گِدھ کہاں کہاں سے آکر اکٹھا ہونے لگے۔ گاؤں کے کتّے پہلے تو ان گِدھوں پر لپکتے لیکن بعد میں یہ پرندے اور کتّے ایک ہی جگہ گوشت کھانے لگے۔ واڑی کے قریب ایک برگد کے پیڑ پر گِدھوں کی چھاؤنی چھائی ہوئی تھی۔ بھاری جسم کے پرندے دن بھر مردہ بھیڑیں کھاتے اور شام کو بڑ کی شاخوں پر بیٹھ کر آرام کرتے تھے۔

سات آٹھ دن کے اندر براگڈریے کا دوسَو بھیڑوں کا ریوڑ صاف ہوگیا۔ برانے اپنی تقدیر پر الزام لگایا، منتیں مانیں۔ اس کا جی بہت بے چین ہو اٹھا۔ اپنی لاڈلی بھیڑوں کو مرتے دیکھ کر ستا رونے لگا لیکن جو ہونا تھا، ہو کر ہی رہا۔ براگڈریا شکستہ حال ہوگیا۔ اس کا پورا ریوڑ ختم ہوگیا۔

لوگ بھوکے رہنے لگے۔ جب تک ممکن تھا انھوں نے چارا خرید کر مویشیوں کو کھلایا، اپنی خوراک کم کر کے انھیں بھوسی چوکر دیا لیکن بعد میں یہ سب باتیں نبھانی مشکل ہوگئیں۔ بھوک کی وجہ سے ان کے پاس چپ چاپ بیٹھے ہوئے کمزور مویشیوں کی قابلِ رحم آنکھیں ان سے دیکھی نہیں جاتی تھیں لیکن وہ کرہی کیا سکتے تھے۔

راموشیوں نے اپنا شراب نکالنے کا پرانا دھندا زوروں سے شروع کردیا لیکن اب شراب کا گاہک نہیں ملتا تھا۔ بانگی کی عورت کو بھگا لے جانے والا وہ آوارہ جگنیا بھوک کی وجہ سے شراب پینے لگا اور اس کے جسم کی ساری چربی بالکل ختم ہوگئی۔ آخر بالکل تنگ آکر تیس پینتیس میل کے فاصلے پر ہودنامی گاؤں میں جا پہنچا۔ اس جیسے کئی اور بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ گاؤں کے کسانوں نے انھیں کھیتوں سے گھاس وغیرہ صاف کرنے کا کام دیا۔ ان نوواردوں کا کیا یقین تھا کہ کب چلے جائیں اس لیے تین دن کا کام پورا ہوتے ہی مزدوری دینے کا وعدہ کیا گیا۔ لوگ کام کرنے لگے۔ جگنیا راموشی نے

دھوتی سے پیٹ کو کس کر تین دن کام کیا۔ بھوک کی شدت ہی میں کھرپی چلائی اور تیسرے دن دھوپ سے بھرے ہوئے اسی کھیت میں وہ ڑھک کر گر پڑا اور ایسا گرا کہ پھر نہیں اٹھا۔

بھوک کی وجہ سے کمزور بیلوں کو گھسیٹتا ہوا شیکو مجھے گاؤں سے باہر جاتا ہوا ملا۔ میں نے پوچھا "شیکوا کہاں کو؟"

شیکو کھڑا ہو گیا اور بولا "ماسٹر جی اب نباہ نہیں ہو رہا۔ بازار میں جاکر بیل بیچ ڈالتا ہوں جہاں جائے گا وہاں پیٹ بھر کر گھاس تو کھائے گا۔"

وہ گیا اور شام کو واپس آیا، بیل ابھی اس کے ساتھ تھا۔

انتظار میں بیٹھی ہوئی گھروالی نے پوچھا "کیوں جی، نہیں بیچا؟"

اس پر عاجزی سے گردن ہلاتے ہوئے شیکو بولا "گاہک ہی نہیں ہے، کہاں بیچتا۔ قصائی نے سات روپے میں مانگا۔ اس کی چھری کھا کر مرنے سے تو اچھا ہے کہ اپنے دروازے پر مرے۔"

بھیڑوں کو بیچ کر اناج لانے کے لیے لوگ دور دور کے بازاروں میں جانے لگے۔ چار چار بھیڑیں دے کر دھڑی دھڑی بھر جوار لینے لگے۔ اس جوار کے دانے گلے کے نیچے نہیں اترتے تھے۔ جو شروع میں گئے ان کی بھیڑیں بک گئیں۔ جو بعد میں گئے وہ خالی ہاتھ لوٹے کسی بھی بازار میں جانوروں کے لیے گاہک نہیں رہا تھا۔ لینے والا اسے لے کر کیا کھلاتا۔ سوکھ کر لکڑی بنا ہوا آنندا ایک دن آیا اور بولا "ماسٹر جی زندہ رہنے کے لیے جاتا ہوں۔"

ماسٹر کہتا بھی تو کیا کہتا لیکن اس نے پوچھا "کدھر جا رہے ہو؟"

"جدھر کی راہ ملے گی اُدھر جاؤں گا۔ جہاں کہیں فصل پانی ہوگا وہاں کام کریں گے اور جئیں گے بچ گئے تو واپس آئیں گے۔" آنندا تھوڑی دیر رُکا اور آہستہ سے بولا "چغل خور کو میں نے اور آبو نے مل کر مارا تھا۔ آپ کو بہت تکلیف دینے لگا تھا اس لیے مارا تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"میرے سر کی قسم۔"

"لیکن آبو تو اس رات میرے پاس سویا تھا۔"

"مار کر آیا اور چپ چاپ لیٹ گیا۔"

یہ اعتراف کر کے آنندا چلا گیا۔

دروازے بند کر کے رامو شی گاؤں چھوڑ کر نکل گئے۔ وہ بیس پچیس آدمی پیٹھ پر بوریا بستر

لادے ہوئے، بار بار پیچھے کی طرف مُڑ مُڑ کر دیکھتے ہوئے گاؤں کو چھوڑ کر جا رہے تھے تاکہ جان بچا سکیں۔ ان کی بکریاں ان کے ساتھ تھیں۔ بچے کندھوں پر تھے، عورتیں بوڑھے سب ساتھ تھے۔ کسی شکاری کے ساز و سامان کی طرح یہ راموشی تپتی ہوئی راہ پر پیر گھسیٹتے ہوئے اناج کی تلاش میں آگے بڑھنے لگے۔ واڈی کا راموشی محلہ خالی ہو گیا۔

پھر آہستہ آہستہ بھیڑوں کے ریوڑ ہانکتے ہوئے گڈریے بھی چلے گئے اور ان کے بالوں والے کتے بھی جن کی بدولت گڈریوں کی زندگی تھی۔ وہ بھیڑیں بھوک سے مرنے لگیں تو جی کڑا کر کے جوان گڈریوں نے گاؤں چھوڑ دیا۔ ان کے پیچھے گھر کے لوگ بھی ہو لیے قحط زدہ علاقے کو چھوڑ کر کہیں بھی جانا تھا، جہاں پیٹ بھرنے کے لیے اناج مل سکے خواہ وہ جگہ کتنی ہی دور اور کہیں کیوں نہ ہو۔

گڈریے جتنا سامان لے جا سکتے تھے اتنا پیٹھ پر لاد کر نکل پڑے۔ مَیں مَیں کرتی ہوئی بھیڑوں کو ہانکتے اور ان کے تھکے ہوئے میمنوں کو گود میں لیتے ہوئے ان کا سفر شروع ہو گیا۔

راما گڈریا جانے سے پہلے مجھ سے گلے ملا اور بولا " دھولا موچی پور کی اور جاتا ہوں۔ وہاں رشتہ دار ہیں۔ بوڑھا تیار نہیں ہے جانے کے لیے، اس کی دیکھ بھال کیجیے گا۔"

بوڑھا کا کوا نہیں گیا۔ وہ گاؤں ہی میں رہ گیا۔ بیٹے نے بہت کہا لیکن وہ کہنے لگا " میں کس لیے جاؤں؟ تم بھیڑوں کو لے جا رہے ہو، انھیں زندہ رکھ رہے ہو اب میرا کیا کام ہے اتنی دوڑ دھوپ کر کے زندہ رہوں۔ میں اب اس قابل نہیں ہوں۔ تم جاؤ۔ میری مٹی تو یہیں کی ہے اور یہیں ختم ہو گی۔"

راما نے کچھ اناج اکٹھا کر کے رکھ دیا۔ بوڑھے کا کھانا پکانے کے لیے اپنی بیوی کو پیچھے چھوڑ دیا اور بھیڑیں لے کر جب جانے لگا تو بوڑھے نے کہا۔ " اگر ساری بھیڑیں لے جا رہے ہو تو میں یہاں کیا کروں گا؟ دو بھیڑیں ہی چھوڑ جاؤ، اپنی روٹی میں سے انھیں کھلا کر پالوں گا۔ اگر نہ نبھے گی تو سبھی مر جائیں گے۔"

بوڑھے کے پاس دو بھیڑیں چھوڑ کر راما اور اس کا جوان بیٹا چلے گئے۔ کسی کسی گھر میں ایک آدھ آدمی رہ گیا ورنہ سب ہی گھر خالی ہو گئے تھے۔ سب رواروی میں چلے گئے۔ نہ کوئی رویا نہ کوئی جھجکا، بس اپنی اپنی راہیں پکڑیں۔

جو مٹھی بھر کسان تھے وہ جمع شدہ اناج کے بل پر ایک مہینہ اور جمے رہے، پھر وہ بھی گئے بالا گڈریا گیا، بیل کوے کر شیکو اور اس کی گھر والی گئی۔ دولا گیا۔ واڈی کے کسان چلے گئے۔ ان

کے گھر بند ہو گئے۔ دروازوں پر تالے پڑ گئے۔ بالا بنگر کی پیٹھ پر لد کر چغل خور دادو بھی گیا اور جاتے ہوئے پاٹھ شالا کے قریب آتے ہی وہ چلّا کر بولا "ماسٹر میں جا رہا ہوں لیکن زندہ رہا تو واپس آؤں گا اور تم سے سمجھ لوں گا۔ ارے مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تو نے ہی میرے ہاتھ پیر توڑے ہیں۔"

صبح شام ہزاروں کی تعداد میں باہر جانے والی اور پھر واڈی میں واپس آنے والی بھیڑیں چلی گئیں۔ جوان گڈریے چلے گئے اور واڈی ویران ہو گئی۔ واپس لوٹنے والی بیاہی بھیڑوں کی آواز اب سنائی نہیں دیتی تھی گویا واڈی گونگی ہو گئی تھی۔ جھونپڑیوں سے دھواں نہیں اٹھتا تھا۔ پاٹھ شالا کے سامنے سبھا نہیں جمتی تھی۔ پاخانہ پیشاب کی بدبو نہیں آتی تھی اور واڈی بے جان ہو گئی تھی۔ پہلے بولتی چالتی تھی لیکن اب تو خاموش تھی۔ ایک بار پانی نہیں برسا، ایک برسات کا موسم خالی گیا اور واڈی ختم ہو گئی۔ وہ راما گڈریا، وہ شیکو، وہ آنندا، وہ چغل خور اور بالا سب غایب ہو گئے۔ اچھے برے سب گئے۔ پاٹھ شالا وہیں رہی، اکھاڑا وہیں رہا، یہ گھر، یہ پیڑ جہاں تھے وہیں رہے لیکن لوگ چلے گئے۔

زور کی ہوا سنسناتی رہی۔ گرد اڑ کر گھروں کے در و دیوار پر بیٹھ گئی۔ گڈریوں نے جو آنگن لیپ پوت کر صاف بنا رکھے تھے وہ گرد اور کوڑے کرکٹ سے بھر گئے۔ چھپروں کی گھاس پھوس ہوا کے زور سے کھل کر بکھر گئی اور ہر جگہ پھیل گئی۔ جہاں سوراخ ہو گئے تھے وہاں سے ہوا گزرتی تو عجیب آواز آتی۔ چھپروں پر رکھے ہوئے شکستہ اوزاروں کے آنگن میں نیچے گرنے کی آواز آنے لگی۔ گھروں کے بند دروازوں کو ہوا دھکے دینے لگی۔ دروازے دھڑ دھڑ کھڑ کھڑ بجنے لگے۔ اکھاڑے میں دھول جم گئی۔ ہودے کی لال مٹی پر گرد کی تہہ بیٹھ گئی۔ مکڑیوں نے جالے بنے۔ گجی کا ڈھول چوہوں نے کتر ڈالا۔ پاٹھ شالا جب بہت دنوں تک لیپی پوتی نہ گئی تو جگہ جگہ سے ایسی اکھڑی کہ پپڑیوں سے بھر گئی۔ بورڈ، میز، صندوق، سب پر گرد جم گئی۔ یہی حال ہنومان جی کے مندر کا تھا۔ ہنومان جی کی لال مورتی دھول سے ڈھک گئی تھی۔

گاؤں میں کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ شام کو روزانہ نیم کی ٹہنی پر آکر بیٹھنے والے بگلوں نے بھی آنا بند کر دیا تھا۔ پاٹھ شالا میں شور مچانے والی چڑیاں کہیں نظر نہیں آتی تھیں۔ بلیاں چاروں طرف گھومنے لگیں۔ رات کو غراتی ہوئی آپس میں لڑنے لگیں اور گھروں میں چوہوں کا شکار کرنے لگیں۔

رات کو کاکوا کی بھیڑیں اکیلے پن کی وجہ سے بیں بیں کرتیں اور ڈھیٹ بھیڑیا گاؤں میں اِدھر اُدھر سونگھتا ہوا گھومتا تھا۔ اکھاڑے، مندر اور گڈریوں کے آنگن کی دھول میں اس کے پیروں کے

نشان صاف نظر آنے لگے تھے۔

صبح کے وقت بوڑھا کاکوواان دو ہی بھیڑوں کو لے کر میدان میں جاتا۔ بھوکی بھیڑیں وہاں اِدھر اُدھر دوڑتی رہتیں۔ ناک اوپر کو اٹھا کر گرم ہوا کو سونگھتیں۔ کھیتوں میں ان کے کھانے کے قابل کچھ نہیں بچا تھا۔ ریوڑ سے الگ ہو جانے کی وجہ سے وہ قابلِ رحم آواز میں چلاتی تھیں۔ کاکوواان سے باتیں کرتا۔ جُتے ہوئے کھیتوں میں دوب کی جڑیں پڑی تھیں۔ ان خشک جڑوں کو چن کر وہ دھوتی کے پلے میں ڈال کر لاتا اور ان دو بھیڑوں کو کھلاتا۔ وہ دن بھر جڑیں چنتا ہوا گھوما کرتا۔ بھیڑیں ممیاتی ہوئی اس کے پیچھے گھومتیں۔ شام ہونے پر ہاہا کرتا ہوا ان بھیڑوں کو ہانکتا ہوا کاکووا گاؤں میں واپس آتا تھا۔

راما کی گھروالی جو پیچھے رہ گئی تھی دوپہر سے سر پر خالی ٹوکری رکھے اور کمر میں کھرپی دابے باہر جاتی تھی۔ دوسرے گاؤں کے سینچائی والے کھیتوں کا چکر کاٹتی اور چھ چھ سات سات میل بھاگ دوڑ کر کے واپس آتی تھی جب کہیں اس کی ٹوکری میں دو چار گاجریں ہوتیں، ایندھن کے لیے اٹھائی ہوئی ٹہنیاں ہوتیں۔ بھیڑوں کے کھانے کے قابل بھوسا ہوتا۔ مانگے تانگے کی اس کمائی کو لے کر وہ شام کو واپس آتی اور گھڑی بھر کے لیے ان کی جھونپڑی میں آگ جلنے کی لالی نظر آتی اور سیاہ سفید دھواں چھپر کے اوپر اڑتا ہوا نظر آتا۔ کبھی کبھار بات چیت بھی سنائی دے جاتی۔ میں بھی بیچ بیچ میں گاؤں جایا کرتا تھا اور یہاں کا احوال سرکار تک پہنچا دیتا تھا۔ ہفتہ میں دو چار دن ہی واڈی میں گزارتا تھا۔ دن میں ہم دو ہی گاؤں میں ہوتے تھے۔ گھٹنے کھڑے کر کے انھیں ہاتھوں سے جکڑ کر آبو وہیں بیٹھا رہتا۔ کبھی جی میں آتا تو پاٹھ شالا اور اکھاڑے میں جھاڑو لگا دیتا۔ میں دن بھر پڑا سویا رہتا یا کچھ پڑھتا رہتا اور مجھے بغیر بتائے آبو بیچ میں ہی نہ جانے کہاں نکل جاتا اور گرد آلود پیر لے کر تھکا ہوا شام کو واپس آتا اور نیچی گردن کر کے بیٹھ جاتا۔ میں پوچھتا کہاں گئے تھے؟" تو کہتا "ٹہلنے گیا تھا!" اور چپ ہو جاتا۔

دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا لیکن رات تو کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ ایسے وقت میں کبھی کبھی کاکووا آجاتا اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ جاتا۔ کمرے میں لیمپ کی ہلکی سی روشنی ہوتی تھی۔ میں اپنے خیالوں میں ڈوبا رہتا۔ آبو اس پریشانی میں اور کاکووایوں ہی اِدھر اُدھر دیکھا کرتا تھا۔ تینوں تین طرف بیٹھتے تھے۔

میں پوچھتا "کاکووا کیا راما کی کوئی اطلاع آئی؟"

"نہیں جی۔"

"گئے ہوئے لوگ اب واپس کب آئیں گے؟"

"بارش ہونے پر ہی آئیں گے۔"

اگر کبھی ہوتے تو اسی طرح کے سوال وجواب ہوتے ورنہ بوڑھا بڑی بڑی دیر تک یوں ہی خاموش بیٹھا رہتا اور پھر آپ ہی اٹھ کر چلا جاتا۔ میں گھر سے لائی ہوئی روٹیوں میں سے دو تین دن کی باسی روٹیاں آبو کو دیتا تو کبھی تو وہ لے لیتا اور کبھی انکار کر دیتا تھا۔ میں زیادہ زور دیتا تو وہ باہر چلا جاتا۔ میں اکیلا ہی بیٹھ کر ان سوکھی روٹیوں کو کھاتا اور پانی پی کر سو جاتا۔

دن کچھ ایسے ہی گزر رہے تھے کہ ایک دن محکمے سے حکم آیا کہ واڑی کی پاٹھ شالا بند کر کے میں تحصیل کے پرائمری اسکول میں چلا جاؤں۔

آبو نے میرا سامان سمیٹا۔ جہاں رہتا تھا وہ جگہ خالی کر دی۔ پاٹھ شالا میں تالا لگایا، کھاڑے میں تالا لگایا۔ میں کھڑا کھڑا کاکووا کے گھر گیا "بابا میں جا رہا ہوں، سرکار نے مجھے واپس بلایا ہے۔" کاکووا نے ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھا۔ دو تین بار راضی برضا ہو کر گردن ہلائی اور کہا "اچھا۔"

بوڑھا زیادہ نہیں بولا۔ اس کی بہو بھی کچھ نہیں بولی۔ نیا آدمی دیکھ کر بھیڑیں دو تین بار ذرا چلائیں اور کاکووا سے رخصت ہو کر باہر نکل آیا۔

آدمی مویشی وغیرہ کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ واڑی کی طرف پیٹھ کیے ہم واپس جا رہے تھے۔ سامان سے بھری ہوئی ایک بوری آبو نے سر پر لاد رکھی تھی اور وہ میرے پیچھے آ رہا تھا۔ کچھ سامان میرے ہاتھ میں تھا۔

بیچ میں آبو رکا اور بوری کو ذرا ٹھیک کر کے میری طرف بغیر دیکھے بولا "اس بوری کو میں آپ کے گھر پہنچا کر واپس لوٹ جاؤں گا۔"

میں نے کچھ بھی نہیں کہا کہ کیا کرو گے اور کہاں جاؤ گے۔ میرے من میں یہ خیال نہیں آیا کہ اس بے چارے کو اب کہاں سے سہارا ملے گا۔ میری پرچھائیں آگے آگے کھسک رہی تھی۔ دھول بڑھ رہی تھی اور سامنے دور تک پھیلے ہوئے میدان میں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا اجڑی ہوئی بنگرواڑی پیچھے رہ گئی تھی اور میں واپس جا رہا تھا!

[م جھ رل]

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی مطبوعات

آبادی	مصنفہ : ڈاکٹر ایس۔ این اگروال	مترجمہ : مخمور جالندھری	۵/۲۵
مٹتی بنتی تصویریں	" : بھگوتی چرن ورما	" : رضیہ سجاد ظہیر	۵/۰۰
زندگی ایک ناٹک	" : پنا لال پٹیل	" : کشور سلطان	۱۰/۰۰
سفید خون	" : نانک سنگھ	" : رتن سنگھ	۸/۰۰
شاعر	" : تاراشنکر بندوپادھیائے	" : پریش کمار ڈے	۸/۷۵
ہندی افسانے	مرتبہ : ڈاکٹر نامور سنگھ	" : اگرسین نارنگ	۷/۵۰
پنجابی افسانے	" : ہربھجن سنگھ	" : مخمور جالندھری	۷/۰۰
تامل افسانے	" : پی۔ پا۔ سوم سندرم	" : حسرت سہروردی	۸/۰۰
آبِ حیات	مصنفہ : مولانا محمد حسین آزاد	تلخیص : پروفیسر احتشام حسین	۶/۷۵
تاش کے محل	" : نپال رنگنا یکما	مترجمہ : زینت ساجدہ	۸/۰۰
اکبر	" : لارنس بنین	" : رضیہ سجاد ظہیر	۳/۵۰
عظیم باغی	مصنفہ : ڈینس کنکیڈ	مترجمہ : ڈاکٹر پرماتما سرن	۶/۲۵
پنڈت وشنو دگامبر	" : وی، آر، اٹھاولے	" : ش، قدوائی	۲/۲۵
قاضی نذر الاسلام	" : بسودھا چکرورتی	" : عرش ملسیانی	۲/۲۵
کبیر	" : ڈاکٹر پارس ناتھ تواری	" : ایم، کے، درانی	۲/۵۰
گرو نانک	" : گوپال سنگھ	" : مخمور جالندھری	۳/۲۵
گرو گوبند سنگھ	" : گوپال سنگھ	" : مخمور جالندھری	۳/۰۰
رنجیت سنگھ	" : ڈی، آر، سود	" : مخمور جالندھری	۲/۵۰
گاندھی کا ہندوستان: کثرت میں وحدت		" : صالحہ عابد حسین	۳/۲۵
کچھوا اور خرگوش	: ڈاکٹر ذاکر حسین	(بچوں کے لیے)	بلا جلد ۱/ مجلد ۲/۰۰
ابو خاں کی بکری اور دوسری کہانیاں	" : ڈاکٹر ذاکر حسین	(بچوں کے لیے)	۲/۵۰

انوکھی دوکان	، : قدسیہ زیدی	(بچوں کے لیے)	۲/۵۰
گلابو چوہیا اور پری زاد	، : قدسیہ زیدی	(بچوں کے لیے)	۲/۰۰
دنیا کے جانور	، : قدسیہ زیدی	(بچوں کے لیے)	۲/۵۰

بچوں کے لیے انتہائی خوبصورت اور دل چسپ کتابیں (نہرو بال پستکالیہ سیریز)

باپو (حصہ اوّل)	مصنفہ : ایف، سی، فریٹاس	مترجمہ : صالحہ عابد حسین	۱/۵۰
، (حصہ دوم)	، ، ، ،	، ، ، ،	۱/۵۰
کشمیر	، : مالا سنگھ (تصاویر: پریمانند)	، : خدیجہ عظیم	۱/۵۰
پرندوں کی دنیا	، : جمال آرا	، : شفیع الدین نیّر	۱/۵۰
ہمالیہ کی چوٹیوں پر	، : بریگیڈیر گیان سنگھ	، : محمد ذاکر	۱/۵۰
ہماری ندیوں کی کہانی (حصہ اوّل)	، : لیلا مجمدار	، : رضیہ سجاد ظہیر	۱/۵۰
جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں	: لیلاوتی بھاگوت	، : رضیہ سجاد ظہیر	۱/۵۰
رسیلی کہانیاں	، : منوج داس	، : صغرا مہدی	۱/۵۰
آؤ ناٹک کھیلیں	، : اومانند	، : رفیعہ منظور الامین	/۵۰
ہماری ریلیں	، : جگجیت سنگھ	، : عرش ملسیانی	۱/۵۰
آزادی کی کہانی (حصہ اوّل)	، : وشنو پربھاکر	، : انور کمال حسینی	۱/۵۰
ہندوستان میں غیر ملکی سیاح	، : ڈاکٹر کے، سی، کھنہ		/۵۰
خالہ بلی کا خاندان	مصنفہ : منوہر داس چترویدی	مترجمہ : شفیع الدین نیّر	۱/۵۰
بہت دن ہوئے (حصہ اول)	، : ایم چوکسی اور پی ایم جوشی	، : رضیہ سجاد ظہیر	۱/۵۰
بہادروں کی کہانیاں	، : راجندر اوستھی	، : انور کمال حسینی	۱/۵۰
روہنت اور نندیہ	، : کرشن چیتنیہ	، : انور کمال حسینی	۱/۵۰
بڑا پانی	، : لیلا مجمدار	، : صالحہ عابد حسین	۱/۵۰
سدا بہار کہانیاں	، : شانتا رنگا چاری	، : انور کمال حسینی	۱/۵۰

اس سلسلے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی ہر زبان کی کچھ منتخب معیاری اور عام پسند کتابوں کا ترجمہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں کیا جائے اور اس کے ذریعہ اس خاص علاقے اور وہاں کے رہنے والوں کی تہذیب، اُن کے رہن سہن، رسم و رواج، غم اور خوشی کا تعارف دوسرے علاقوں کے پڑھنے والوں سے کرایا جا سکے۔ کتابوں کا انتخاب اِسی مقصد کے پیشِ نظر کیا جائے گا اور عام طور پر کتابیں حالیہ دور اور عصری ادب سے لی جائیں گی۔

ہمارے ملک میں بہت سی زبانیں ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ پڑوسی زبانوں کے اظہارِ خیال یا تہذیبی اور سماجی دھاراؤں سے ہم بہت کم واقف ہیں اور اس طرف توجہ بھی کم دی گئی ہے۔ یورپ جیسے بَرِّاعظم میں جہاں الگ الگ ملک ہیں اور ہُن کی زبانیں بھی مختلف ہیں یہ ممالک اس سے کہیں زیادہ روابط رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو ادبی اور تہذیبی سطح پر متاثر کرتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ اس قسم کے ربط سے ہمارے مختلف لسانی علاقوں کے ا... کو ایک دوسرے کے قریب آنے میں مدد ملے گی اور وہ ایک دوسرے کو زیادہ ... سکیں گے۔ قومی یکجہتی کے کام میں بھی اس سے مدد ملے گی۔